بغیر عنوان کے (ناول)

(از سعادت حسن منٹو)

آئے دن سعید کو زُکام ہوتا تھا۔ایک دن جب اُس زُکام نے تازہ حملہ کیا تو اس نے سوچا، مجھے عشق کیوں نہیں ہوتا؟ سعید کے جتنے دوست تھے سب کے سب عشق کر چکے تھے۔ان میں سے کچھ ابھی تک اس میں گرفتار تھے لیکن جس قدر وہ محبت کو اپنے پاس دیکھنا چاہتا، اُسی قدر اُس کو اپنے سے دُور پاتا۔ عجیب بات ہے مگر اس کو ابھی تک کسی سے عشق نہیں ہوا تھا جب کبھی وہ سوچتا کہ واقعی اس کا دل عشق و محبت سے خالی ہے تو اسے شرمندگی سی محسوس ہوتی اور وقار کو ٹھیس سی پہنچتی۔

بیس برس کا عرصہ جس میں کئی برس اس کے بچپن کی بے شعوری کی دُھند میں لپٹے ہوئے تھے، کبھی کبھی اس کے سامنے لاش کی مانند اکڑ جاتا تھا اور سوچتا کہ اس کا وجود اب تک بالکل بیکار رہا ہے۔ محبت کے بغیر آدمی کیونکر مکمل ہو سکتا ہے ؟۔

سعید کو اس بات کا احساس تھا۔ کہ اس کا دل خوبصورت ہے اور اس قابل ہے کہ محبت اس میں رہے، لیکن وہ مرمریں محل کس کام کا جس میں رہنے والا کوئی بھی نہ ہو۔ چونکہ اسکا دل محبت کرنے کا اہل تھا۔یہی وجہ ہے کہ اسے اس خیال سے بہت دُکھ ہوتا کہ اس کی دھڑکنیں بالکل فضول ضائع ہو رہی ہیں۔

اس نے لوگوں سے سُنا تھا، زندگی میں ایک بار محبت ضرور آتی ہے۔ خود اسے بھی اس بات کا ہلکا سا یقین تھا کہ موت کی طرح محبت ایک بار آئے گی۔ مگر کب ؟ کاش اس کی کتاب حیات اس کی اپنی جیب میں ہوتی، جسے کھول کہ وہ اس کا جواب فوراً پالیتا، مگر یہ کتاب تو واقعات خود لکھتے ہیں، جب محبت آئے گی تو خود بخود اس کتاب حیات میں نئے ورقوں کا اضافہ ہو جائیگا۔ وہ ان نئے ورقوں کے اضافے کے لیے کتنا بیتاب تھا۔

وہ چپ چاپ اُٹھ کر ریڈیو پر گیت سُن سکتا تھا۔ جب چاہے کھانا کھا سکتا تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق ہر وقت وسکی بھی پی سکتا تھا جس کی اس کے مذہب میں ممانعت تھی۔ وہ اگر چاہتا تو اُسترے سے اپنے گال بھی زخمی کر لیتا مگر حسب منشاء کسی سے محبت نہیں کر سکتا تھا۔

ایک بار اُس نے بازار میں ایک نوجوان لڑکی دیکھی۔ اس کی چھاتیاں دیکھ کر اُسے ایسا معلوم ہوا کہ دو بڑے بڑے شلجم ڈھیلے کرتے میں چھپے ہوئے ہیں۔ شلجم اُسے بہت پسند تھے۔ سردیوں کے موسم میں کوٹھے پر جب اُس کی ماں لال لال شلجم کاٹ کر سکھانے کے لیے ہار پرویا کرتی تھی تو وہ کئی کچے شلجم کھا جایا کرتا تھا۔ اُس لڑکی کو دیکھ کر اس کی زبان پر وہی ذائقہ پیدا ہوا، جو شلجم کا گودا چباتے وقت پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس کے دل میں اس سے عشق کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ وہ اس کی چال کو غور سے دیکھتا رہا، جس میں ٹیڑھا پن تھا، ویسا ہی ٹیڑھا پن جیسا کہ برسات کے موسم میں چارپائی کے پایوں میں کان کے باعث پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ وہ اس کے عشق میں خود کو گرفتار نہ کر سکا۔

عشق کرنے کے ارادے سے وہ اکثر اوقات اپنی گلی کی نکڑ پر دریوں کی دُکان پر جا بیٹھتا تھا۔ یہ دکان سعید کے ایک دوست کی تھی، جو ہائی سکول کی ایک لڑکی سے محبت کر رہا تھا۔ اس لڑکی سے اُس کی محبت لدھیانے کی ایک دری کے ذریعے سے پیدا ہوئی تھی۔ دری کے دام اس لڑکی کے بیان کے بموجب اُس کے دوپٹے کے پلوّ سے کھل کر کہیں گر پڑے تھے۔ لطیف چونکہ اس کے گھر کے پاس رہتا تھا اس لیے اس نے اپنے چچا کی جھڑکیوں اور گالیوں سے بچنے کے لیے اس سے دری اُدھار مانگی اور دونوں میں محبت ہو گئی۔ شام کو بازار میں آمد و رفت زیادہ ہو جاتی اور دربار صاحب جانے کے لیے چونکہ راستہ وہی تھا اس لیے عورتیں بھی کافی تعداد میں اس کی نظروں کے سامنے سے گذرتی تھیں، مگر جانے کیوں اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ جتنے لوگ بازار میں چلتے پھرتے ہیں، سب کے سب شفاف ہیں۔ اُس کی نگاہیں کسی عورت کسی مرد پر نہیں رکتی تھیں۔ لوگوں کی بھیڑ باڑ کو اس کی آنکھیں ایک ایسی متحرک جھلی سمجھتی تھیں، جس میں سے وہ آسانی کے ساتھ جدھر چاہیں دیکھ سکتی ہیں۔

اس کی آنکھیں کدھر دیکھتی تھیں۔ یہ نہ آنکھوں کو معلوم تھا اور نہ سعید کو اس کی نگاہیں دُور بہت دُور سامنے چونے اور گارے کے بنے ہوئے پختہ مکانوں کو چھیدتی ہوئی نکل جاتیں، نہ جانے کہاں اور خود ہی کہیں گھوم گھام کر اُس کے دل

کے اندر آجاتیں بالکل ان بچوں کے مانند جو اپنی ماں کی چھاتی پر اوندھے منہ لیٹے، ناک، کان اور بالوں سے کھیل کھال کر اپنے ہی ہاتھوں کو تعجب آمیز دلچسپی سے دیکھتے دیکھتے نیند کے نرم نرم گالوں میں دھنس جاتے ہیں۔

لطیف کی دکان پر گاہک بہت کم آتے تھے اس لیے وہ اس کی موجودگی کو غنیمت جانتے ہوئے اس سے مختلف قسم کی باتیں کیا کرتا تھا، لیکن وہ سامنے لٹکی ہوئی دری کی طرف دیکھتا رہتا۔ جس میں رنگ برنگ کے بیشمار دھاگوں کے الجھاؤ نے ایک ڈیزائن پیدا کر دیا تھا۔ لطیف کے ہونٹ ہلتے رہتے اور وہ یہ سوچتا رہتا کہ اس کے دماغ کا نقشہ دری کے ڈیزائن سے کسقدر ملتا جلتا ہے بعض اوقات تو وہ یہ خیال کرتا کہ اس کے اپنے خیالات ہی باہر نکل کر اس دری پر رینگ رہے ہیں۔

اس دری میں اور سعید کی دماغی حالت میں بلا کی مشابہت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ رنگ برنگ کے دھاگے کے الجھاؤ نے اس کے سامنے دری کی صورت اختیار کرلی تھی، اور اسکے رنگ برنگے خیالات و محسوسات کا اُلجھاؤ ایسی صورت اختیار نہیں کرتا تھا، جس کو وہ دری کی مانند اپنے سامنے بچھا کر یا لٹکا کر دیکھ سکتا۔

لطیف بے حد خام تھا، گفتگو کرنے کا سلیقہ تک اُسے نہیں آتا تھا۔ کسی شے میں خوبصورتی تلاش کرنے کے لیے اگر اس سے کہا جاتا تو وہ فرطِ حیرت سے بالکل بیوقوف دکھائی دیتا، اس کے اندر وہ بات ہی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک آرٹسٹ میں پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے باجود ایک لڑکی اُس سے محبت کرتی تھی اس کو خط لکھتی تھی، جس کو البتہ لطیف یوں پڑھتا تھا جیسے کسی تیسرے درجے کے اخبار میں جنگ کی خبریں پڑھ رہا ہے۔ ان خطوط میں وہ کپکپاہٹ اُسے نظر نہیں آتی تھی جو ہر لفظ میں گندھی ہوئی ہے۔ وہ لفظوں کی نفسیاتی اہمیت سے بالکل بے خبر تھا۔ اس سے اگر یہ کہا جاتا، دیکھو لطیف یہ پڑھو۔۔۔۔ لکھتی ہے، میری پھوپھی نے کل مجھ سے کہا کہ کیا ہوا ہے تیری بھوک کو؟ تو نے کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا ہے جب میں نے سُنا تو معلوم ہوا کہ سچ مچ میں آجکل بہت کم کھاتی ہوں۔ دیکھو میرے لیے کل شہاب الدین کی دوکان سے کھیر لیتے آنا۔ جتنی لاؤ گے سب چٹ کر جاؤں گی۔ اگلی پچھلی کسر نکال دوں گی۔ کچھ معلوم ہوا تمھیں اسی سطر میں کیا ہے۔۔۔۔۔۔ تم شہاب الدین کی دوکان سے کھیر کا بہت بڑا ڈونا لے کر جاؤ گے تو لوگوں کی نظروں سے بچ بچا کر ڈیوڑھی میں جب تم اُسے یہ تحفہ دو گے تو اس خیال سے خوش نہ ہونا کہ وہ ساری کھیر کھا جائے گی، وہ کبھی نہیں کھا سکے گی، پیٹ بھر کر وہ کچھ کھا ہی نہیں سکتی۔ جب دماغ میں خیالات کا ہجوم جمع ہو جائے تو پیٹ خود بخود بھر جایا کرتا ہے لیکن یہ فلسفہ اس کی سمجھ میں کیسے آتا۔ وہ سمجھنے سمجھانے سے بالکل کورا تھا، جہاں تک شہاب الدین کی دوکان سے چار آنے کی

کھیر اور ایک آنے کی خوشبودار ربڑی خریدنے کا تعلق تھا، لطیف بالکل ٹھیک تھا، لیکن کھیر کی فرمائش کیوں کی گئی تھی اور اس کے ذریعے سے اشتہار پیدا کرنے کا خیال کن حالات کے تحت اس کی محبوبہ کے دماغ میں پیدا ہوا۔ اس سے لطیف کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ ان باریکیوں کو سمجھ سکے۔ وہ موٹی عقل کا آدمی تھا جو لوہے کے زنگ آلود گز سے نہایت بھونڈے طریقے سے دریاں ماپتا تھا، اور شاید اسی طرح کے گز سے اپنے احساسات کی پیمائش بھی کرتا تھا۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک لڑکی اُس کی محبت میں گرفتار تھی جو ہر جہت سے اُس کے مقابلہ میں ارفع واعلیٰ تھی۔ لطیف اور اس میں اتنا ہی فرق تھا جتنا لدھیانے کی دری اور کشمیر کے گدگدے قالین ہیں۔

سعید کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ محبت کیسے پیدا ہوتی ہے بلکہ یوں کہیے کہ پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ خود جس وقت چاہے رنج والم طاری کر سکتا تھا۔ محبت جس کے لیے وہ اس قدر بے تاب تھا۔

اس کا ایک اور دوست جو اسقدر کاہل تھا کہ مونگ پھلی اور چنے صرف اسی صورت میں کھا سکتا تھا، اگر ان کے چھلکے اُترے ہوئے ہوں اپنی گلی کی ایک حسین لڑکی سے محبت کر رہا تھا، لیکن اگر اس سے پوچھا جاتا، یہ حسن تمہاری محبوبہ میں کہاں سے شروع ہوتا ہے تو یقیناً وہ خالی الذہن ہو جاتا، جس کا مطلب وہ بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ کالج میں تعلیم پانے کے باوجود اُس کے ذہن کی نشو نما بڑے ادنیٰ طریقے پر ہوئی تھی۔ لیکن اس کی محبت کی داستان اتنی لمبی تھی کہ اقلیدس سے بڑی کتاب تیار ہو جاتی۔ آخر ان لوگوں کو، ان جاہلوں کو عشق و محبت کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟۔ کئی بار یہ سوال سعید کے دماغ میں پیدا ہوا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ محبت کرنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے، خواہ وہ بے شعور ہو یا باشعور۔ دوسروں کو محبت کرتے دیکھ کر دراصل اس کے دل میں حسد کی چنگاری بھڑک اُٹھتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بہت بڑا کمینہ پن ہے مگر وہ مجبور تھا محبت کرنے کی خواہش اس پر اس قدر غالب رہتی کہ بعض اوقات دل ہی دل میں محبت کرنے والوں کو گالیاں بھی دیا کرتا۔ لیکن گالیاں دینے کے بعد اپنے آپ کو بھی کوستا کہ ناحق اُس نے دوسروں کو بُرا بھلا کہا۔ اگر دنیا کے سارے آدمی ایک دم محبت کرنے لگیں تو اس میں میرے باوا کا کیا جاتا ہے۔ مجھے صرف اپنی ذات سے تعلق رکھنا چاہیے اگر میں کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتا تو اسمیں دوسروں کا کیا قصور ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میں کسی

لحاظ سے اس قابل ہی نہیں ہوں۔ کیا پتہ ہے کہ بیو قوف اور بے عقل ہونا ہی محبت کرنے کے لیے ضروری ہو۔۔۔۔۔
۔
سوچتے سوچتے ایک دن وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ محبت ایکدم پیدا نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ محبت ایک دم پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس کے دل میں اب سے بہت عرصہ پہلے محبت پیدا ہو گئی ہوتی۔ کئی لڑکیاں اُس کی نگاہوں سے اب تک گذر چکی تھیں۔ اگر محبت ایکدم پیدا ہو سکتی تو وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ خود کو بڑی آسانی کے ساتھ وابستہ کر سکتا تھا۔ کسی لڑکی کو صرف ایک دو بار دیکھ لینے سے محبت کیسے پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

تھوڑے روز ہوئے ایک دوست نے جب اس سے کہا: کمپنی باغ میں آج میں نے ایک لڑکی دیکھی۔ ایک ہی نظر میں اس نے مجھے گھائل کر دیا تو اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ ایسے فقرے اسے بہت پست معلوم ہوتے تھے۔ ایک ہی نظر میں اُس نے مجھے گھائل کر دیا۔ ''لاحولَ وَلا۔۔۔۔۔ جذبات کا کس قدر عامیانہ اظہار ہے۔''

جب وہ اس قسم کے پست اور تیسرے درجے کے فقرے کسی کی زبان سے سنتا تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ ڈال دیا گیا ہے۔ مگر پست ذہنیت اور لنگڑے مذاق کے لوگ اس سے زیادہ خوش تھے۔ یہ لوگ جو عشق و محبت کی لطافتوں سے باکل کورے تھے۔ اس کے مقابلے میں بہت زیادہ سکون اور آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

محبت اور زندگی کو ایم اسلم کی نگاہوں سے دیکھنے والے خوش تھے مگر سعید جو کہ محبت اور زندگی کو اپنی صاف اور شفاف آنکھوں سے دیکھتا تھا، مغموم تھا۔۔۔۔۔۔۔ بے حد مغموم۔۔۔۔۔

ایم اسلم سے اُسے بے حد نفرت تھی، اتنا چھچھورا رُومان نویس۔۔۔۔۔۔ اس کی نظروں سے کبھی نہ گذرا تھا۔ اُس کے افسانے پڑھ کر اُس کا خیال ہمیشہ ٹبی اور کٹڑہ کنیاں کی کھڑکیوں کی طرف دوڑ جاتا۔ جن میں سے رات کو کسبیوں کے غازہ لگے گال نظر آتے ہیں مگر تعجب ہے کہ اکثر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں اُسی کے افسانے معاشقہ پیدا کرتے تھے۔

جو عشق ایم اسلم کے افسانے پیدا کرتے ہیں، کس قسم کا عشق ہو گا! جب وہ اس پر تھوڑی دیر غور کرتا تو اُسے تصور میں یہ عشق ایک ایسے سفلے آدمی کی شکل میں دکھائی دیتا جس نے نمائش کی خاطر اپنے سب اچھے اچھے کپڑے پہن رکھے ہوں، ایک کے اوپر ایک!

ایم اسلم کے افسانوں کے بارے میں اُس کی رائے کیسی بھی ہو لیکن یہ حقیقت تھی کہ نوجوان لڑکیاں انہیں چھپ چھپ کر پڑھتی تھیں اور جب ان کے جذبات برانگیختہ ہوتے تھے، تو وہ اُسی آدمی سے محبت کرنا شروع کر دیتی تھیں جو ان کو سب سے پہلے نظر آجائے۔ اسی طرح بہزادؔ جس کی غزلیں ہندوستان کی ہر جان اور بائی رات کو کوٹھوں پر گاتی ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت مقبول تھا۔ کیوں؟ یہ اس کی سمجھ سے بالا تر تھا۔ بہزادؔ کی وہ عامیانہ غزل جس کا مطلع:

ع: دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے

ہے۔ قریب قریب ہر شخص گاتا تھا۔ اس کے اپنے گھر میں اس کی چپٹی ناک والی نوکرانی جو اپنی جوانی کی منزلیں طوعاً و کرہاً طے کر چکی تھی، برتن مانجتے وقت ہمیشہ دھیمے سُروں میں گنگنایا کرتی تھی:

ع: دیوانہ بنانا ہے دیوانہ بنادے

اس غزل نے اسے دیوانہ بنادیا تھا، جہاں جاؤ ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے'' الاپا جا رہا ہے۔ آخر کیا مطلب ہے کوٹھے پر چڑھو تو کانا اسمٰعیلی ایک آنکھ سے اپنے اُڑتے ہوئے کبوتروں کی طرف دیکھ کر اونچے سُروں میں گا رہا ہے ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے'' دریوں کی دوکان پر بیٹھو تو بغل کی دُوکان میں لالہ کشوری مل بزاز اپنے بڑے بڑے چوتڑوں کی گدیوں پر آرام سے بیٹھ کر نہایت بھونڈے طریقے سے گانا شروع کر دیتا ہے:

''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے'' دریوں کی دُوکان سے اُٹھو اور بیٹھک میں جا کر ریڈیو کھولو تو اختری بائی فیض آباد گا رہی ہے:

ع: دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے

کیا بیہودگی ہے وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا لیکن ایک روز جبکہ وہ بالکل خالی الذہن تھا اور پان بنانے کے لیے چھالیا کاٹ رہا تھا تو اُس نے خود غیر ارادی طور پر گانا شروع کر دیا: ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے''

وہ اپنے آپ میں بے حد خفیف ہوا۔ اُسے خود پر بہت غصہ بھی آیا لیکن پھر ایکا ایکی زور سے ہنسنے کے بعد اُس نے جان بوجھ کر اونچے سُروں میں گانا شروع کر دیا "دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنادے" یوں گاتے ہوئے اُس نے تصور میں بہزاد کی شاعری ایک قہقہے کے نیچے دبادی اور جی ہی جی میں خوش ہو گیا۔

ایک دوبار اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ بھئی ایم اسلم کی افسانہ نویسی اور بہزاد کی شاعری کا گرویدہ ہو جائے اور یوں کسی کے عشق کرنے میں کامیابی حاصل کرے۔ لیکن قصد کرنے پر بھی وہ ایم اسلم کا افسانہ پورا نہ پڑھ سکا اور نہ بہزاد کی غزل ہی میں کوئی خوبصورتی دیکھ سکا۔ ایک دن اس نے اپنے دل میں عہد کر لیا۔ "جو ہو سو ہو" میں ایم اسلم اور بہزاد کے بغیر ہی اپنی خواہش پوری کروں گا۔ جو خیالات میرے ذہن میں ہیں ان سب کے سمیت میں کسی لڑکی سے محبت کروں گا۔۔۔۔ "یہی ہے نا کہ ناکام رہوں گا تو بھی ناکامی ان دوڈ گڈگی بجانے والوں سے اچھی ہے" اُس دن سے اس کے اندر عشق کرنے کی خواہش اور بھی تیز ہو گئی اور اُس نے ہر روز صبح کو ناشتہ کیے بغیر ریل کے پھاٹک پر جانا شروع کر دیا، جہاں سے کئی لڑکیاں سکول کی طرف جاتی تھیں۔

پھاٹک کے دونوں طرف لوہے کا ایک بہت بڑا توا جس پر لال روغن پینٹ کیا گیا تھا، جڑا تھا۔ دُور سے جب وہ ان دو لال لال تووں کو ایک دوسرے کے پیچھے دیکھتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ فرنیٹر میل آرہی ہے۔ پھاٹک کے پاس پہنچتے ہی فرنیٹر میل مسافروں سے لدی ہوئی آتی اور دندناتی ہوئی اسٹیشن کی جانب غائب ہو جاتی۔

پھاٹک کھلتا اور وہ لڑکیوں کے انتظار میں ایک طرف کھڑا ہو جاتا۔ اُدھر سے پچیس چھبیس لڑکیاں وقت پر ادھر سے گذرتیں اور لوہے کی پٹریوں کو طے کر کے کمپنی باغ کے ساتھ والی سڑک کی طرف ہو جاتیں۔ جدھر اُن کا سکول تھا۔ ان چھبیس لڑکیوں میں سے دس کو جو کہ ہندو تھیں وہ اس لیے غور سے نہ دیکھ سکا کہ باقی سولہ مسلمان لڑکیوں کی شکل وہ صورت برقعوں میں چھُپی رہتی تھیں۔

دس روز وہ متواتر پھاٹک پر جاتا رہا۔ شروع شروع میں دو تین دن ان پردہ پوش اور بے پردہ لڑکیوں کی طرف متوجہ رہا، مگر دسویں روز جب صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، جس میں کمپنی باغ کے تمام پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اُس نے یک لخت اپنے آپ کو لڑکیوں کے بجائے ان پست قد درختوں کی طرف متوجہ پایا جن میں بے شمار چڑیاں چہچہاتی تھیں۔ صبح کی خمار آلودہ خاموشی میں چڑیوں کا چہچہانا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اُس نے غور کیا تو اُسے

پتہ چلا کہ وہ ایک ہفتہ سے لڑکیوں کی بجائے ان چڑیوں، درختوں اور فرنٹیر میل کی موت جیسی یقینی آمد سے دلچسپی لیتا رہاہے۔

عشق شروع کرنے کے لیے اُس نے اور بھی بہت سے حیلے کیے مگر وہ ناکام رہا۔ آخر کار اس نے سوچا کیوں نہ اپنی گلی ہی میں کوشش کی جائے۔ چنانچہ ایک روز اس نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر گلی کی ان تمام لڑکیوں کی فہرست بنائی جن سے عشق کیا جاسکتا تھا۔ جب فہرست تیار ہو گئی تو نو(۹) لڑکیاں اُس کے پیش نظر تھیں۔

نمبر ایک حمیدہ، نمبر دو صغرا، نمبر تین نعیمہ، نمبر چار پشپا، نمبر پانچ بملا، نمبر چھ راجکماری، نمبر سات فاطمہ عرف پھاتو، نمبر آٹھ زبیدہ عرف بیدی۔

نمبر ۹۔۔۔۔اس کا نام اُسے معلوم نہ تھا۔ یہ لڑکی پشمینے کے سوداگروں کے ہاں نوکر تھی۔

اب اُس نے نمبر وار غور کرنا شروع کیا۔

حمیدہ خوبصورت تھی، بڑی بھولی بھالی لڑکی۔ عمر بمشکل پندرہ برس کی ہو گی۔ سدا متبسم رہتی تھی، بڑی نازک، اُسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفید شکر کی پتلی ہے۔ بھر بھری، اگر ذرا اس کو ہاتھ لگایا تو اس کے جسم کا کوئی حصہ گر جائے گا۔ ننھے سے سینے پر چھاتیوں کا ابھار ایسے تھا جیسے کسی مدھم راگ میں دُوسر غیر ارادی طور پر اُونچے ہو گئے ہیں۔

اگر اُس سے وہ کبھی یہ کہتا، حمیدہ میں تم سے محبت کرنا چاہتا ہوں تو یقیناً اُس کے دل کی حرکت بند ہو جاتی۔ وہ اسے سیڑھیوں ہی میں ایسی باتیں کہہ سکتا تھا۔ تصور میں وہ حمیدہ سے ایسی جگہ ملا۔۔۔۔۔۔وہ اُوپر سے تیزی کے ساتھ نیچے اُتر رہی تھی۔ اس نے اُسے روکا اور اس کی طرف غور سے دیکھا، اس کا ننھا سا دل سینہ میں پھڑ پھڑایا جیسے تیز ہوا کے جھونکے سے دیے کی لو، وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔

حمیدہ سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھی کہ اس سے محبت کی جاتی۔ وہ صرف شادی کے قابل تھی۔ کوئی بھی خاوند اس کے لیے مناسب تھا۔ کیونکہ اس کے جسم کا ہر ذرّہ بیوی تھا۔ اُس کا شمار ان لڑکیوں میں ہو سکتا تھا جن کی ساری زندگی شادی کے بعد گھر کے اندر سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ جو بچے پیدا کرتی ہیں اور چند ہی برسوں میں اپنا سارا رنگ روپ کھو دیتی ہیں۔ اور رنگ رُوپ کھو کر بھی جن کو اپنے میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا۔

ایسی لڑکیوں سے محبت کا نام سُن کر جو یہ سمجھیں ایک بہت بڑا گناہ ان سے سرزد ہو گیا ہے، وہ محبت نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اگر وہ کسی روز غالب کا ایک شعر اُسے سُنا دیتا تو کئی دنوں تک نماز کے ساتھ بخشش کی دُعائیں مانگ کر بھی وہ سمجھتی کہ اُس کی غلطی معاف نہیں ہوئی اور اس پر جو اُدھم مچتا اس کے تصور ہی سے سعید کانپ کانپ اُٹھتا، جبکہ اس نے اپنی ماں سے فوراً ہی ساری بات کہہ سنائی ہوتی۔ ظاہر ہے کہ سب اُسے مجرم قرار دیتے اور ساری عمر کے لیے اُس کے کردار پر ایک بدنما داغ لگ جاتا۔ کوئی اس بات کی طرف دھیان نہ دیتا کہ وہ صدقِ دل سے محبت کرنے کا متمنی ہے۔

نمبر دو صغیرہ اور نمبر ۳ نعیمہ کے بارے میں سوچنا ہی بے کار تھا۔ اس لیے کہ وہ ایک کٹر مولوی کی لڑکیاں تھیں۔ اُن کا تصور کرتے ہی سعید کی آنکھوں کے سامنے اُس مسجد کی چٹائیاں آ گئیں جن پر مولوی قدرت اللہ صاحب لوگوں کو نماز پڑھانے اور اذان دینے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ لڑکیاں جوان اور خوبصورت تھیں، مگر عجیب بات ہے کہ چہرے محراب نما تھے۔ جب سعید اپنے گھر میں بیٹھا ان کی آواز سنتا تو اُسے ایسا لگتا کہ عادت کے طور پر کوئی دھیمے دھیمے سُروں میں دُعا مانگ رہا ہے۔ ایسی دعا جس کا مطلب وہ خود بھی نہیں سمجھتا۔ ان کو صرف خدا سے محبت کرنا سکھایا گیا تھا۔ اسی لیے سعید ان سے محبت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ انسان تھا اور انسان کو اپنا دل دینا چاہتا تھا۔ صغرا اور نعیمہ کی اس دنیا میں اس طور پر تربیت ہو رہی تھی کہ وہ دوسرے جہان میں نیکو کار مردوں کے کام آ سکیں۔

جب سعید نے ان کے متعلق سوچا تو اپنے آپ سے کہا:۔

"بھئی نہیں، ان سے میں عشق نہیں کر سکتا۔ جو انجام کار دوسرے آدمیوں کے حوالے کر دی جائیں گی۔ مجھے اس دنیا میں گناہ بھی کرنے ہیں، اس لیے میں یہ جوا کھیلنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے یہ نہ دیکھا جائے گا کہ اس دنیا میں جس سے میں محبت کرتا ہوں، چند گناہوں کے بدلے وہ کسی پرہیز گار کے سپرد کر دی جائیں"۔

چنانچہ اُس نے فہرست میں سے صغرا اور نعیمہ کا نام کاٹ دیا۔

نمبر چار پُشپا، نمبر پانچ بملا، نمبر چھ راجکماری۔ یہ تین لڑکیاں جن کا آپس میں خدا معلوم کیا رشتہ تھا، سامنے والے مکان میں رہتی تھیں۔ پشپا کے متعلق سوچ بچار کرنا فضول تھا، اس لیے کہ اس کا بیاہ ہونے والا تھا، ایک بزاز سے جس کا نام اتنا ہی بدصورت تھا جتنا پشپا کا خوبصورت۔ وہ اکثر اُسے چھیڑا کرتا تھا اور کھڑکی میں سے اُس کو اپنی کالی اچکن دکھا کر کہا کرتا

تھا۔ پشپا بتاؤ تو میری اچکن کا رنگ کیسا ہے۔ پشپا کے گالوں پر ایک سیکنڈ کے لیے گلاب کی پتیاں سی تھرتھرا جاتیں اور وہ بہادری سے جواب دیا کرتی ''کالا''

اس کے ہونے والے خاوند کا نام کالو مل تھا۔ لاحول ولا۔ کس قدر غیر شاعرانہ نام۔ جانے اس کا نام رکھتے ہوئے اس کے والدین نے کیا مصلحت دیکھی تھی۔

وہ جب پشپا اور کالو مل کے متعلق سوچتا تو اپنے دل سے کہا کرتا، ''اگر اور کسی وجہ سے شادی رُک نہیں سکتی تو صرف اسی وجہ سے روک دینی چاہیئے کہ اس کے ہونے والے پتی کا نام نہایت ہی لغو ہے۔۔۔۔۔ کالو مل۔۔۔۔۔ ایک کالو اور پھر اس پر ''مل'' لعنت ہے۔۔۔۔۔۔ آخر اس کا مطلب کیا ہوا۔۔۔۔۔''

لیکن پھر سوچتا، اگر پشپا کی شادی کالو مل بزاز سے نہ ہوئی تو کسی گھسیٹا رام حلوائی یا کسی کروڑی مل صراف سے ہو جائے گی۔ بہر حال وہ اس سے عشق نہیں کر سکتا تھا اور اگر کرتا تو اُسے ہندو مسلم فساد کا ڈر تھا۔ مسلمان اور ہندو لڑکی سے محبت کرے۔۔۔۔۔۔ اوّل تو محبت ویسے ہی بہت بڑا جرم ہے اور پھر مسلمان لڑکے اور ہندو لڑکی کی محبت۔۔۔۔۔ نیم پر کریلا چڑھانے والی بات ہے۔

شہر میں کئی ہندو مسلم فساد ہو چکے تھے، لیکن جس گلی میں سعید رہتا تھا، نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کے اثرات سے اب تک محفوظ رہی تھی۔ اگر وہ پشپا، بملا یا راجکماری سے محبت کرنے کا ارادہ کر لیتا تو ظاہر ہے کہ دنیا کی تمام گائیں اور تمام سُور اُس گلی میں اکٹھے ہو جاتے۔ ہندو مسلم فسادوں سے سعید کو سخت نفرت تھی، اس لیے نہیں کہ لوگ ایک دوسرے کا سر پھوڑتے ہیں اور لہو کے چھینٹے اُڑتے ہیں، نہیں۔ اس لیے کہ ان فسادوں میں سر نہایت بھدے طریقے پر پھوڑے جاتے ہیں۔ اور لہو جیسی خوبصورت شے کو نہایت ہی بھونڈے طریقے پر بکھیرا جاتا ہے۔

راجکماری جو ان دونوں سے چھوٹی تھی، اُسے پسند تھی۔ اس کے ہونٹ جو سانس کی کمی کے باعث خفیف طور پر کھلے رہتے تھے، اُسے بے حد پسند تھے۔ ان کو دیکھ کر اُسے ہمیشہ خیال آتا تھا کہ شاید ایک بوسہ ان کے ساتھ چھو کر آگے نکل گیا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے راجکماری کو، جو ابھی اپنی عمر کی چودھویں منزل طے کر رہی تھی، اپنے مکان کی تیسری منزل پر غسل خانے میں نہاتے دیکھا تھا۔

اپنے مکان کے جھرنوں سے جب سعید نے اُس کی طرف دیکھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا کوئی نہایت ہی اچھوتا خیال دماغ میں سے اُتر کر سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔ سُورج کی موٹی موٹی کرنیں جن میں بیشمار فضائی ذرے مقیش کا چھڑکاؤ سا کر رہے تھے، اس کے ننگے بدن پر پھیل رہی تھیں۔ ان کرنوں نے اس کے گورے بدن پر سونے کا پترا سا چڑھا دیا تھا۔ بالٹی میں سے جب اُس نے ڈونگا نکالا اور کھڑی ہو کر اپنے بدن پر پانی ڈالا تو وہ سونے کی پتلی دکھائی دی۔ پانی کے موٹے موٹے قطرے اس کے بدن پر سے گر رہے تھے اور جیسے سونا پگھل کر گر رہا تھا۔

راجکماری، پشپا اور بملا کے مقابلے میں بہت ہوشیار تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں جو ہر وقت یوں متحرک رہتی تھیں جیسے خیالی جرابیں بُن رہی ہیں۔ اسے بہت پسند تھیں۔ ان انگلیوں میں رعنائی تھی اور اس رعنائی کا ثبوت کروشیئے اور سُوئی کے ان کاموں سے ملتا تھا جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔

ایک بار راجکماری کے ہاتھ کا بنا ہوا میز پوش دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ اُس نے اپنے دل کی بہت سی دھڑکنیں بھی ، غیر ارادی طور پر اس کے ننھے ننھے خانوں میں گوند دی ہیں۔ ایک بار جبکہ وہ اس کے بالکل پاس کھڑی تھی اس کے دل میں محبت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر جب اُس نے راجکماری کی طرف دیکھا تو وہ اُسے ایک مندر کی صورت میں دکھائی دی۔ جس کے پہلو میں وہ خود مسجد کی شکل میں کھڑا تھا۔۔۔۔ مسجد اور مندر میں کیونکر دوستی ہو سکتی ہے۔

گلی کی تمام لڑکیوں کے مقابلے میں یہ ہندو لڑکی ذہنی لحاظ سے بلند تھی۔ اس کی پیشانی، جس پر ہر وقت ایک مدھم سی سلوٹ گہرائی اختیار کرنے کا ارادہ کیے رکھتی تھی، اُسے بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا ماتھا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کہا کرتا: جب دیباچہ اتنا خوبصورت ہے تو معلوم نہیں کتاب کتنی دلچسپ ہو گی۔ مگر۔۔۔ آہ۔۔۔ یہ مگر!۔۔۔ اس کی زندگی میں یہ مگر سچ مچ کا مگر بن کر رہ گیا تھا، جو اُسے غوطہ لگانے سے ہمیشہ باز رکھتا تھا۔

نمبر سات فاطمہ عرف پھاتو، خالی نہیں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ عشق سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک امجد سے جو ورکشاپ میں لوہے کا کام کرتا تھا اور دوسرا اسکے چچیرے بھائی سے جو دو بچوں کا باپ تھا۔ فاطمہ عرف پھاتو ان دونوں بھائیوں سے عشق کر رہی تھی۔ گویا ایک پتنگ سے دو پیچ لڑا رہی تھی ایک پتنگ میں جب دو اور پتنگ اُلجھ جائیں تو کافی دلچسپی پیدا ہوتی ہے لیکن اگر اس تگڈے میں ایک اور پیچ کا اضافہ ہو جائے تو ظاہر ہے کہ الجھاؤ ایک بھول بھلیاں کی صورت اختیار کر لے گا۔ اس قسم کا اُلجھاؤ سعید کو پسند نہیں تھا۔ اس کے علاوہ پھاتو جس قسم کے عشق میں گرفتار

تھی، نہایت ہی ادنٰی قسم کا تھا۔ جب سعید اس قسم کے عشق کا تصور کرتا تو پرانی عشقیہ داستانوں کی بوڑھی کٹنی پیلے کاغذوں کے بدبودار انبار میں سے اس کی آنکھوں کے سامنے لاٹھی ٹیکتی ہوئی آجاتی اور اس کے طرف یوں دیکھتی جیسے کہنا چاہتی ہے کہ میں آسمان کے تارے توڑ کر لاسکتی ہوں۔ بتا تیری نظر کس لونڈیا پر ہے۔۔۔۔ یوں چٹکیوں میں میں تجھ سے ملادوں گی۔

اس بُڑھیا کے تصور کے ساتھ وہ پائیں باغ کے متعلق سوچتا، یا ظاہرا پیر کا مزار اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ جہاں وہ بڑھیا اس کی محبوبہ کو کسی بہانے سے لاسکتی تھی۔۔۔ اس خیال کے آتے ہی اسکی محبت کا سارا جذبہ سمٹ جاتا اور ایک ایسی قبر کی صورت اختیار کرلیتا، جس پر سبز رنگ کا غلاف چڑھا ہوا ہو اور بے شمار ہار اس پر بکھرے ہوں۔۔۔۔

کبھی کبھی اسے یہ بھی خیال آتا، اگر کٹنی ناکام رہی تو کچھ دنوں کے بعد اس محلے سے میرا جنازہ نکلے گا اور دوسرے محلے سے میری محبوبہ کا یہ دونوں جنازے راستے میں ٹکرائیں گے اور دو تابوتوں کا ایک تابوت بن جائے گا یا پھر عشقیہ داستانوں کے انجام کی طرح جب مجھے اور میری محبوبہ کو دفن کیا جائے گا تو ایک معجزہ رونما ہوگا اور دونوں قبریں آپس میں مل جائیں گی۔ وہ یہ بھی سوچتا کہ اگر وہ مرگیا اور اس کی محبوبہ کسی وجہ سے جان نہ دے سکی تو ہر جمعرات کو اس کی قبر پر نازک نازک ہاتھ پھول چڑھایا کریں گے اور دیا بھی جلایا کریں گے بال کھول کر وہ اپنا سر قبر کے ساتھ پھوڑا کرے گی اور چغتائی ایک اور تصویر بنادے گا، جس کے نیچے یہ لکھا ہوگا:

ع: ہائے اس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

یا کوئی شاعر ایک اور غزل لکھدے گا۔ ایک زمانے تک تماش بین جسے کوٹھوں پر طبلے کی تھاپ کے ساتھ سنتے رہیں گے۔ اس غزل کے شعر اس قسم کے ہوں گے:

میری لحد پہ کوئی پردہ پوش آتا ہے

چراغ گورِ غریباں صبا بجھادینا

ایسے شعر جب کبھی وہ کسی غزل میں دیکھتا تو اس نتیجے پر پہنچتا کہ عشق تو گورکن ہے جو ہر وقت کاندھے پر کدال رکھے عاشقوں کے لیے قبریں کھودنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس عشق سے وہ عشق کا مقابلہ کرتا، جس کا تصور اس کے ذہن

میں تھا،ان میں زمین و آسمان کا فرق پاتا تو یہ سوچتا کہ یا تو اس کا دماغ خراب ہے یا وہ نظام ہی خراب ہے جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔

سعید اگر کوئی دیوان کھولتا تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کسی قصائی کی دُوکان میں داخل ہو گیا ہے۔ ہر شعر اُسے بے کھال کا بکرا دکھائی دیتا جس کا گوشت چربی سمیت بو پیدا کر رہا ہو، ہر بات زُبان پر ایک خاص ذائقہ پیدا کرتی ہے۔ جب وہ اس قسم کے شعر پڑھتا تو اُس کی زبان پر وہی ذائقہ پیدا ہو جاتا جو قربانی کا گوشت کھاتے وقت وہ محسوس کرتا تھا۔

وہ سوچتا جس صوبے میں آبادی کا چوتھا حصہ شاعر ہے اور ایسے ہی شعر کہتا ہے وہاں محبت ہمیشہ گوشت کے لوتھڑوں کے نیچے دبی رہے گی یہ مایوسی کسی نہ کسی وجہ سے ایک دو روز کے بعد غائب ہو جاتی اور وہ پھر نئی تازگی کے ساتھ اپنی محبت کے مسئلے پر غور و فکر کرنا شروع کر دیتا۔

نمبر ۸ زبیدہ عرف بیدی بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی لڑکی تھی۔ دُور سے دیکھنے پر گندھے ہوئے میدے کا ایک ڈھیر دکھائی دیتی تھی۔ گلی کے ایک لڑکے نے اُس کو ایک بار آنکھ مار دی۔ بیچارے نے یوں اپنی محبت کی بسم اللہ کی تھی۔ لیکن اس کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ لڑکی نے اپنی ماں کو ساری رام کہانی سنائی، ماں نے اپنے بڑے لڑکے سے پوشیدہ طور پر بات چیت کی اور اُس کو غیرت دلائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آنکھ مارنے کے دوسرے روز شام کو جب عبدالغنی صاحب طبابت عرف حکمت سیکھ کر گھر واپس آئے تو ان کی دونوں آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں، کہتے ہیں کہ زبیدہ عرف بیدی چق میں سے یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سعید کو چونکہ اپنی انکھیں بہت پسند تھیں، اس لیے وہ زبیدہ کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ عبدالغنی نے آنکھ کے پلکارے سے محبت کا آغاز کرنا چاہا تھا۔ سعید کو یہ طریقہ بازاری معلوم ہوتا تھا۔ وہ اگر اس کو اپنی محبت کا پیغام دینا چاہتا تو اپنی زبان استعمال کرتا جو دوسرے روز ہی کاٹ لی جاتی۔ عمل جراحی کرنے سے پہلے زبیدہ کا بھائی کبھی نہ پوچھتا کہ بات کیا ہے بس وہ غیرت کے نام پر چُھری چلا دیتا۔ اس کو اس کا خیال کبھی نہ آتا کہ وہ چھ لڑکیوں کی عصمت برباد کر چکا ہے، جن کی داستانیں وہ بڑے مزے سے اپنے دوستوں کو سنایا کرتا ہے۔

نمبر ۹ جس کا نام اُسے معلوم نہیں تھا، پشمینے کے سوداگروں کے ہاں نوکر تھی، ایک بہت بڑا گھر تھا جس میں چاروں بھائی رہتے تھے۔ یہ لڑکی جو کشمیر کی پیداوار تھی ان چاروں بھائیوں کے لیے سردیوں میں شال کا کام دیتی تھی۔ گرمیوں میں

وہ سب کے سب کشمیر چلے جاتے تھے اور وہ اپنی کسی دُور کی رشتہ دار عورت کے پاس چلی جاتی تھی۔ یہ لڑکی جو عورت بن چکی تھی، دن میں ایک دو مرتبہ اس کی نظروں کے سامنے سے ضرور گذرتی تھی اور اس کو دیکھ کر وہ ہمیشہ یہی خیال کیا کرتا تھا کہ اس نے ایک عورت نہیں بلکہ تین چار عورتیں اکٹھی دیکھی ہیں۔ اس لڑکی کے متعلق جس کے بیاہ کے بارے میں اب چاروں بھائی فکر کر رہے تھے۔ اس نے کئی بار غور کیا، وہ اس کی ہمت کا بہت قائل تھا کہ وہ گھر کا سارا کام کاج اکیلی سنبھالتی تھی۔ اور ان چاروں سوداگر بھائیوں کی فرداً فرداً خدمت بھی کرتی تھی۔

وہ بظاہر خوش تھی، ان چار سوداگر بھائیوں کو جن کے ساتھ اس کا جسم متعلق تھا وہ ایک ہی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس کی زندگی جیسا کہ ظاہر ہے کہ ایک عجیب وغریب کھیل تھا۔ جس میں چار آدمی حصہ لے رہے تھے ان میں سے ہر ایک کو یہ سمجھنا پڑتا تھا کہ باقی تین بیوقوف ہیں اور جب اس لڑکی کے ساتھ ان میں سے کوئی مل جاتا تو وہ دونوں مل کر یہ سمجھتے ہونگے کہ گھر میں جتنے آدمی رہتے ہیں سب کے سب اندھے ہیں، لیکن کیا وہ خود اندھی نہیں تھی۔ اس سوال کا جواب سعید کو نہیں ملتا تھا۔ اگر وہ اندھی ہوتی تو بیک وقت چار آدمیوں سے تعلقات پیدا نہ کرتی بہت ممکن ہے وہ ان چاروں کو ایک ہی سمجھتی ہو۔ کیونکہ مرد اور عورت کا جسمانی تعلق عام طور پر ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

وہ اپنی زندگی کے دن بڑے مزے سے گذارتی تھی۔ چاروں سوداگر بھائی اُسے چھپ چھپ کر کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہوں گے، کیونکہ جب مرد کسی عورت کے ساتھ کچھ عرصہ لُطف انگیز تخلیئے میں گذارتا ہے تو اس کے دل میں اُس کی قیمت ادا کرنے کی خواہش ضرور پیدا ہوتی ہے، چونکہ یہ خواہش عام طور پر تخلیہ حاصل کرنے سے پہلے پیدا ہوتی ہے، اس لیے زیادہ بار آور ثابت ہوتی ہے۔

سعید اس کو اکثر بازار میں شہاب الدین کی دوکان پر کھیر کھاتے یا بھائی کیسر سنگھ میوہ فروش کی دوکان کے پاس پھل کھاتے دیکھتا تھا۔ اُسے ان چیزوں کی ضرورت تھی اور پھر جس آزادی سے وہ پھل اور کھیر کھاتی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ان کا ایک ایک ذرہ ہضم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ایک بار جب سعید شہاب الدین کی دوکان پر فالودہ پی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اتنی ثقیل شے کیسے ہضم کر سکے گا، وہ آئی اور چار آنے کی کھیر میں ایک آنے کی ربڑی ڈلوا کر دو منٹوں میں ساری پلیٹ چٹ کر گئی یہ دیکھ کر سعید کو رشک ہوا۔

جب وہ چلی گئی تو شہاب الدین کے ہونٹوں پر ایک میلی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اُس نے کسی کو بھی، جو سُن لے، مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''سالی مزے کر رہی ہے''

یہ سُن کر اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا جو کوہے مٹکاتی پھلوں کی دوکان کے پاس پہنچ چکی تھی اور شاید بھائی کیسر سنگھ کی داڑھی کا مذاق اُڑا رہی تھی۔۔۔۔۔وہ ہر وقت خوش رہتی تھی۔ اور اُس کو خوش دیکھ کر سعید کو بہت دُکھ ہوتا تھا۔ خدا معلوم کیوں اُس کے دل میں یہ عجیب و غریب خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وہ خوش نہ رہے۔

سن تیس کے آغاز تک وہ اس لڑکی کے متعلق یہی فیصلہ کرتا رہا کہ اُس سے محبت نہیں کی جا سکتی۔

(۲)

سن اکتیس کے شروع ہونے میں صرف رات کے چند برفائے ہوئے گھنٹے باقی تھے۔ سعید لحاف میں سردی کی شدت کے باعث کانپ رہا تھا۔ وہ پتلون اور کوٹ سمیت لیٹا تھا، لیکن اس کے باوجود سردی کی لہر اس کی ہڈیوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے کی سبز روشنی میں جو سردی میں اضافہ سا کر رہی تھی، اُس نے زور سے ٹہلنا شروع کر دیا تاکہ دورانِ خون تیز ہو جائے۔

تھوڑی دیر یوں چلنے پھرنے کے بعد جب اُس کے اندر گرمی پیدا ہوئی تو وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سُلگا کر اپنا دماغ ٹٹولنے لگا۔ اُس کا دماغ بالکل چونکہ خالی تھا اس لیے اس کی قوتِ سامعہ بہت تیز تھی، کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں مگر وہ باہر گلی میں ہوا کی مدھم گنگناہٹ بڑی آسانی سے سُن رہا تھا۔

اس گنگناہٹ میں اُسے انسانی آوازیں سُنائی دیں۔ ایک دبی دبی چیخ دسمبر کی آخری رات کی خاموشی میں چابک کے اوّل کی طرح اُبھری پھر کسی کی اِلتجائیہ آواز لرزی وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے کھڑکی کی درز میں سے باہر کی طرف دیکھا۔

وہی۔۔۔وہی لڑکی، یعنی سوداگروں کی نوکرانی بجلی کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی، صرف ایک سفید بنیان میں، بجلی کی سفید روشنی میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بدن پر برف کی ایک پتلی سی تہ جم گئی ہے۔ اس کی بنیان کے نیچے اس کی

بد نما چھاتیاں ناریلوں کی طرف لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس انداز میں کھڑی تھی، گویا ابھی ابھی کشتی سے فارغ ہوئی ہے،اس حالت میں دیکھ کر سعید کے مسناعانہ جذبات کو دھکا سالگا۔

اتنے میں کسی مرد کی بھنچی ہوئی آواز آئی۔۔۔۔۔خدا کے لیےاندر چلی آؤ۔۔۔۔کوئی دیکھ لے گاتو آفت ہی آجائے گی۔

وحشی بلی کی طرح غرا کر لڑکی نے جواب دیا، نہیں آؤں گی۔۔۔۔۔بس ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں آؤں گی۔۔۔۔۔

سب سے چھوٹے سوداگر کی آواز آئی:

"خدا کے لیےاونچے نہ بولو۔۔۔۔۔کوئی سن لے گاراجو۔۔۔۔"

تواس کانام راجو تھا۔

راجو نے اپنی لنڈوری چٹیا کو جھٹکادے کر کہا۔۔،"سُن لے خدا کرے کوئی سُن لے۔۔۔۔اوراگر تم یونہی مجھے اندر آنے کے لیے کہتے رہے تو میں خود محلے بھر کو جگا کر سب کچھ کہہ دُوں گی۔۔۔۔ سمجھے ؟"

راجو سعید کو نظر آرہی تھی مگر جس سے وہ مخاطب تھی اُس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

اُس نے بڑے سوراخ میں سے راجو کی طرف دیکھا تواس کے بدن پر جھرجھری سی طاری ہوگئی۔اگر وہ ساری کی ساری ننگی ہوتی توشاید اس کے صناعانہ جذبات کو اتنی ٹھیس نہ پہنچتی لیکن اس کے جسم کے وہ حصے ننگے تھے جو دوسرے مستور حصوں کو عریانی کی دعوت دے رہے تھے۔راجو برقی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی۔سعید کو ایسا محسوس ہوا کہ عورت کے متعلق اس کے تمام جذبات اپنے کپڑے اُتار رہے ہیں۔

راجو کی غیر متناسب باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، نفرت انگیز طور پر لٹک رہی تھیں۔مردانہ بنیان کے کھلے اور گول گلے میں سے اس کی نیم پختہ ڈبل روٹی جیسی موٹی اور نرم چھاتیاں کچھ اس انداز سے باہر جھانک رہی تھیں گویا سبزی ترکاری کی ٹُوٹی ہوئی ٹوکری میں سے گوشت کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہیں۔زیادہ استعمال سے گھسی ہوئی پتلی بنیان کا نچلا گھیرا خود بخود اوپر کو سمٹ گیا تھا اور ناف کا گڈھا اس کے خمیرے آٹے جیسے پھولے ہوئے پیٹ پر یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نے اُنگلی کھبو دی ہے۔

یہ نظارہ دیکھ کر سعید کے دماغ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔ اُس نے چاہا کہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بستر کی طرف چلا جائے اور سب کچھ بھول بھال کے سو جائے۔ لیکن جانے کیوں سُوراخ پر آنکھ جمائے کھڑا رہا۔ راجو کو اس حالت میں دیکھ کر اُس کے دل میں کافی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ شاید اسی نفرت کے باعث وہ اس سے دلچسپی لے رہا تھا۔

سوداگر کے سب سے چھوٹے لڑکے نے جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ ہو گی، ایک بار پھر التجائیہ لہجہ میں کہا۔۔۔

۔ "راجو خدا کے لیے اندر چلی آؤ" میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی نہیں ستاؤں گا۔۔۔ لو اب مان جاؤ۔۔۔۔ دیکھو خدا کے لیے اب مان جاؤ۔۔۔۔ یہ تمہاری بغل میں وکیلوں کا مکان ہے ان میں سے کسی نے دیکھ لیا تو بڑی بدنامی ہو گی"۔

راجو خاموش رہی لیکن تھوڑی دیر کے بعد بولی، مجھے میرے کپڑے لا دو بس اب میں تمہارے یہاں نہیں رہوں گی۔ میں تنگ آ گئی ہوں، میں کل سے وکیلوں کے ہاں نوکری کر لوں گی۔۔۔ سمجھے! اب اگر تم نے مجھ سے کچھ کہا تو خدا کی قسم شور مچانا شروع کر دوں گی۔ میرے کپڑے چپ چاپ لا کر دے دو۔

سوداگر کے لڑکے کی آواز آئی۔۔۔ لیکن تم رات کہاں کاٹو گی؟۔

راجو نے کہا جہنم میں۔ تمہیں اس سے کیا، جاؤ تم اپنی بیوی کی بغل گرم کرو میں کہیں نہ کہیں سو جاؤں گی۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔۔۔۔۔۔ آنسو۔۔۔۔۔۔ وہ سچ مچ رو رہی تھی۔

سُوراخ پر سے آنکھ ہٹا کر سعید پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ راجو کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُسے عجیب قسم کا صدمہ ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صدمے کے ساتھ وہ نفرت بھی لپٹی ہوئی تھی جو راجو کو اس حالت میں دیکھ کر سعید کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ مگر غایت درجہ نرم دل ہونے کے باعث وہ پگھل سا گیا۔ راجو کی آنکھوں میں جو شیشے کے مرتبان میں چمکدار مچھلیوں کی طرح سدا متحرک رہتی تھیں، آنسو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ اُٹھ کر اُسے دلاسہ دے۔

راجو کی جوانی کے چار قیمتی برس سوداگر بھائیوں نے معمولی چٹائی کی طرف استعمال کیے تھے۔ ان برسوں پر چاروں بھائیوں کے نقشِ قدم کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ ان میں سے اب کسی کو اس بات کا خوف ہی نہیں رہا تھا کہ کوئی ان کے پیروں کے نشان پہچان لے گا اور "راجو" کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ اپنے قدموں کے نشان دیکھتی

تھی، نہ دوسروں کے، اسے بس چلتے جانے کی دھن تھی، کسی بھی طرف، مگر اب شاید اُس نے مڑ کر دیکھا تھا۔۔۔۔۔۔ مڑ کر اُس نے کیا دیکھا تھا، جو اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے؟۔۔۔۔ یہ سعید کو معلوم نہیں تھا۔

جو چیز معلوم نہ ہو اُس کو معلوم کرنے کی خواہش شاید ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کرسی پر بیٹھا سعید دیر تک اپنی معلومات کو اُلٹ پلٹ کر کے سوچتا رہا اور جب اُٹھ کر اُس نے کچھ اور دیکھنے کے لیے سُوراخ پر آنکھ جمائی تو راجو وہاں نہیں تھی۔ دیر تک وہ اس سوراخ پر آنکھ جمائے رہا، لیکن اُسے لالٹین کی برفیلی روشنی، گلی کے ناہموار فرش اور گندی موری کے سوا جس میں پالک کے بے شمار ڈنٹھل پڑے تھے اور کچھ نظر نہ آیا۔

باہر سن تیس کی آخری رات دم توڑ رہی تھی اور اسکا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

راجو کہاں ہے۔۔۔۔۔۔ کیا اندر چلی گئی ہے۔۔۔۔۔ کیا مان گئی ہے۔۔۔۔ مگر سوال ہے کہ وہ کس بات پر جھگڑی تھی؟۔

راجو کے کانپتے ہوئے نتھنے ابھی تک سعید کو نظر آرہے تھے ضرور اس کے اور سوداگر کے چھوٹے لڑکے کے درمیان جس کا نام محمود تھا، کسی بہت بڑی بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ جبھی تو وہ دسمبر کی خون منجمد کر دینے والی رات میں صرف ایک بنیان اور شلوار کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ اور اندر جانے کا نام تک نہیں لیتی تھی۔

جب سعید سوچتا کہ ان کے درمیان جھگڑے کی بناء۔۔۔۔۔ مگر وہ اس بناء پر غور ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کس قدر گھناؤ نا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا، لیکن وہ خیال کرتا کہ یہ بات جھگڑے کا باعث نہیں ہو گی کیونکہ وہ دونوں تو اس کے عادی تھے۔ ایک زمانہ سے راجو ان سوداگر بھائیوں کو بڑے سلیقے سے ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھلا رہی تھی۔ لیکن اب ایکا ایکی کیا ہو گیا تھا۔ راجہ کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں ضدی مکھی کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔۔۔۔ جہنم میں۔ ۔۔۔ تمھیں اس سے کیا۔۔۔۔۔۔ جاؤ تم اپنی بیوی کی بغل گرم کرو۔۔۔۔ میں کہیں نہ کہیں سو جاؤں گی۔۔۔۔۔۔ ان الفاظ میں درد تھا۔

اس کو دُکھی دیکھ کر سعید کے ایک نامعلوم جذبے کو تسکین ضرور پہنچی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں رحم بھی پیدا ہوا تھا۔ کسی عورت سے اُس نے آج تک ہمدردی ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ اس سے ہمدردی کا اظہار کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اس کو سہہ لیتی، اگر وہ گلی کی کسی اور لڑکی سے ہمدردی کا اظہار کرتا تو ظاہر ہے، بہت بڑی آفت برپا ہو جاتی۔

کیونکہ اس کی ہمدردی کا مطلب کچھ اور ہی لیا جاتا۔۔۔راجو کے سوا گلی کی تمام لڑکیاں ایسی زندگی بسر کر رہی تھیں جس میں ایسے لمحات بہت ہی کم آتے ہیں جب ان سے خاص قسم کی ہمدردی کی جاسکتی ہے اور اگر ایسے لمحات آتے ہیں تو فوراً ہی ان کے سینوں میں ہمیشہ کیلیے دفن ہو جاتے ہیں۔اُمیدوں اور تمناؤں کی قبریں آکر بنتی ہیں تو فاتحہ پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی۔ یا اسکا موقعہ ہی نصیب نہیں ہوتا۔اگر محبت کی کوئی چِتا تیار ہوتی ہے تو آس پاس کے لوگ اس پر راکھ ڈال دیتے ہیں، کہ شعلے نہ بھڑکیں۔

سعید سوچتا کہ یہ کتنی تکلیف دہ مصنوعی زندگی ہے۔ کسی کو اجازت نہیں کہ وہ اپنی زندگی کے گڑھے دوسروں کو دکھائے وہ لوگ جن کے قدم مضبوط نہیں ان کو اپنی لڑکھڑاہٹیں چھپانا پڑتی ہیں کیونکہ ان کا رواج ہے ہر شخص کو ایک زندگی اپنے لیے اور ایک دوسروں کے لیے بسر کرنا ہوتی ہے۔ آنسو بھی دو قسم کے ہوتے ہیں اور قہقہے بھی دو قسم کے، ایک وہ آنسو جو زبردستی آنکھوں سے نکالنے پڑتے ہیں اور ایک وہ جو خود بخود نکلتے ہیں۔ایک قہقہہ وہ ہے جو تنہائی ہی میں بلند کیا جاسکتا ہے، دوسرا وہ ہے جو خاص آداب اور خاص اصولوں کے تحت حلق سے بُلند کرنا پڑتا ہے۔

شاعر جس کی ساری عمر کوٹھوں پر اور شراب کے ٹھیکوں میں گذری ہو موت کے بعد حضرت مولانا اور رحمتہ اللہ علیہ بنادیا جاتا ہے۔اگر اس کی لائف لکھی جاتی تو اس کو فرشتہ ثابت کرنا سوانح نگار اپنا فرض سمجھتا ہے۔ آغا حشرؔ کی ساری زندگی کسبیوں میں گذری، مگر موت کے فوراً بعد ہی اس کے سارے کریکٹر کو دھوبی کے ہاں بھیج دیا گیا، جب وہاں سے واپس آیا اور لوگوں نے دیکھا تو اس میں کوئی داغ، کوئی شکن نہیں تھی۔

گدھے، گھوڑے، خچر، اُونٹ غرضیکہ ہر جاندار اور بے جان شے پر اخلاق مردِ تسمہ پا کی طرح سوار ہے۔ادب پر شاعری پر تاریخ پر ہر انسان کی گردن پر اخلاق بٹھا دیا گیا ہے۔ مہاتما گاندھی سے لے کر ماسٹر نثار گویئے تک سب کے سب اخلاق زدہ ہیں۔ سعید حق بجانب تھا کہ راجو کی سدا متبسم آنکھوں میں آنسو نظر آئیں اور وہ ان آنسوؤں کو اخلاق سے بے پرواہ ہو کر اپنی اُنگلیوں سے چھوئے، وہ اپنے آنسوؤں کا ذائقہ اچھی طرح جانتا تھا، مگر وہ دوسروں کی آنکھوں کے آنسو بھی چکھنا چاہتا تھا، خاص کر کسی عورت کے آنسو! چونکہ عورت شجرِ ممنوعہ ہے اس لیے اس کی یہ خواہش اور بھی تیز ہو گئی۔

سعید کو یقین تھا کہ اگر وہ راجو کے قریب ہونا چاہے گا تو وہ جنگلی گھوڑی کی طرف بدکے گی نہیں۔ راجو غلاف چڑھی عورت نہیں تھی، وہ جیسی تھی دُور سے نظر آجاتی تھی۔ اُس کو دیکھنے کے لیے خوردبین یا کسی اور آلے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بالکل شفاف تھی، اس کی بھدی اور موٹی ہنسی جو اکثر اس کے مٹمیلے ہونٹوں پر بچوں کے ٹوٹے ہوئے گھر ہوندے کی مانند نظر آتی تھی، اصلی ہنسی تھی۔ بڑی صحت منداور اب کہ اس کی سدا متحرک آنکھوں نے آنسواُگلے تھے تو ان میں کوئی مصنوعی پن نہیں تھا۔ راجو کو سعید ایک مدت سے جانتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے چہرے کے خطوط تبدیل ہوئے تھے اور وہ غیر محسوس طریقے پر لڑکی سے عورت بننے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔۔۔۔ ۔۔۔ چونکہ اس کے اندر ایک کے بجائے تین چار عورتیں تھیں یہی وجہ ہے کہ چار سوداگر بھائیوں کو وہ ہجوم نہیں سمجھتی تھی۔ یہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہجوم سعید کو پسند نہیں تھا۔ اس لیے کہ ایک عورت کے ساتھ وہ صرف ایک مرد منسلک دیکھنے کا قائل تھا، مگر یہاں یعنی راجو کے معاملے میں اُسے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے درمیان رُک جانا پڑتا تھا، کیونکہ مختلف قسم کے خیالات اس کے دماغ میں جمع ہو جاتے، اور بعض اوقات اُسے غیر ارادی طور پر راجو کو داد دینا پڑتی۔ یہ داد کس بات کی تھی، اس کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ خیالات کی بھیڑ بھاڑ میں وہ اس جذبے کو پہچاننے سے ہمیشہ قاصر رہتا تھا جو اس داد کا محرک ہوا کرتا تھا۔

گلی کے سب باشعور آدمی راجو کے متعلق جانتے تھے۔ ماسی مختو گلی کی سب سے عمر رسیدہ عورت تھی۔ اس کا چہرہ ایسا تھا جیسے پیلے رنگ کے سوت کی اٹیاں بڑی بے پرواہی سے نوچ کر ایک دوسرے میں اُلجھادی گئی ہیں۔ یہ بُڑھیا بھی جس کی آنکھوں کو بہت کم سجھائی دیتا تھا اور جس کے کان قریب قریب بہرے تھے، راجو سے چلم بھرواکر اُس کی غیبت میں اپنی بہو سے یا جو کوئی بھی اُس کے پاس بیٹھا ہو تو کہا کرتی تھی: ''اس لونڈیا کو گھر میں زیادہ نہ آنے دیا کرو'' ورنہ کسی روز اپنے خصموں سے ہاتھ دھو بیٹھو گی''۔ یہ کہتے وقت شاید اس بُڑھیا کی تمام جھریوں میں اس کی گُم گشتہ جوانی کی یاد رینگ جاتی تھی۔

راجو کی غیر حاضری میں سب اس کو بُرا کہتے تھے اور ان گناہوں کے لیے خدا سے معافی مانگتے تھے جو شاید آگے چل کر ان سے سرزد ہو جائیں۔ عورتیں جب راجو کا ذکر کرتیں تھیں تو اپنے آپ کو بہت بلند سیرت تصور کرتی تھیں۔

اور دل ہی دل میں یہ سوچ کر فخر محسوس کرتی تھیں کہ ان کے دم سے نسوانیت کا وقار قائم ہے۔۔۔۔۔۔!

سب راجو کو بُرا سمجھتے تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے سامنے آجتک کسی نے بھی نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ محبت پیار سے اس کے ساتھ پیش آتے تھے، شاید اس کا باعث وہی نام نہاد اخلاقی معیار ہو۔ مگر اس اچھے سلوک میں راجو کی خوش باش اور دوسروں کو ممنون کرنے والی طبیعت کو بھی کافی دخل تھا۔ سوداگروں کے گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر جب کبھی وہ کسی ہمسایہ کے ہاں جاتی تو وہاں بیکار گپ نہیں اُڑاتی تھی۔ کبھی کسی کے سر میں سے جوئیں نکال دیں۔ مٹھی چاپی کر دی۔ بغیر کام کے دراصل وہ کہیں بیٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے موٹے اور بھدے ہاتھوں میں بلا کی پھرتی تھی اور اس کا دل جیسا کہ ظاہر ہے، ہر وقت اس تلاش میں رہتا تھا کہ کسی کو خوش کرنے کا موجب ہو۔

راجو دوسروں کی خدمت میں کئی کئی گھنٹے صرف کرتی تھی مگر شاباش یا شکریہ کے الفاظ سننے کے لیے ایک منٹ بھی انتظار نہیں کرتی تھی، ماسی مختو کی چلم بھری، سلام کیا اور چلدی، مصنف صاحب کو بازار سے فالودہ لا کر دیا، اُن کے بچے کو تھوڑی دیر گود میں کھلایا اور چلی گئی، غلام محمد بیچہ بند کی بڑھیا دادی کی پنڈلیاں سہلائیں اور اس کی دُعائیں لیے بغیر چلدی۔

یہ گنٹھیا کی ماری بڑھیا، جو اپنی عمر کی ایسی منزل پر پہنچ گئی تھی، جہاں اس کا وجود ہونے یا نہ ہونے کے برابر تھا، اور جسے غلام محمد حقے کا بیکار نیچہ سمجھتا تھا۔ راجو کے ہاتھوں ایک عجیب قسم کی راحت پاتی تھی۔ اس کی اپنی بیٹیاں اس کے پاؤں دابتی تھیں مگر ان کی مُٹھیوں میں وہ رس نہیں تھا جو راجو کے ہاتھوں میں تھا۔ جب راجو اس کی پنڈلیاں سہلاتی تو وہ فرشتہ تصور کرتی مگر اس کے چلے جانے کے بعد فوراً ہی کہا کرتی ”حرام زادی اس طرح پیر دبا دبا کر ان سوداگر بچوں کو پھانسہ ہو گا۔۔۔۔۔؟“

خیالات کی رو جانے سعید کو کہاں بہالے گئی۔۔۔۔۔ یکایک وہ چونکا اور سُوراخ پر آنکھ جما کر اُس نے پھر باہر کی طرف دیکھا، بجلی کی روشنی گلی میں ٹھٹھر رہی تھی۔ رات کی خاموش گنگناہٹ سُنائی دے رہی تھی، مگر راجو وہاں نہیں تھی!

اُس نے کھڑکی کا دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ اس سرے سے اُس سرے تک رات کی سرد خاموشی بہہ رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لالٹین کے نیچے کبھی کوئی کھڑا ہی نہیں تھا۔ پیلی روشنی میں عجیب قسم کی ویرانی گھلی ہوئی تھی۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس کی زندگی اور افیون کھانے والے آدمیوں کے چہروں جیسی گلی میں کتنی مشابہت تھی۔

سعید نے کھڑکی کا دروازہ بند کر دیا، سونے کی خاطر اُس نے لحاف اوڑھا تو ایک بار پھر سردی اس کی ہڈیوں تک پہنچنے لگی۔۔۔۔۔

(۳)

نیا سال دھوپ تاپ رہا تھا۔ سعید ابھی تک بستر ہی میں لیٹا تھا، صرف لیٹا نہیں تھا بلکہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اس لیے کہ رات بھر جاگتا رہا تھا۔ کہیں سات بجے کے قریب اُس کی آنکھ لگی تھی، یہی وجہ ہے کہ گیارہ بجنے پر بھی اُس نے جاگنے کا نام نہیں لیا تھا۔

سرہانے پڑی ہوئی ٹائم پیس نے بارہ مرتبہ ٹن ٹن کی مگر دھات کی اس آواز کی بجائے اس کے کانوں نے راجو کی آواز سُنی جیسے بڑی دُور سے آرہی ہے۔ وہ ایک دم جاگ پڑا۔ یوں ایکا ایکی بیدار ہونے پر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گھبرا کے اٹھا ہے اور اس کا ریشمی پاجامہ باوجود سنبھالنے کے نیچے پھسل گیا ہے اس کی ہلکی پھلکی نیند اسی بنڈے طریقے سے پھسل گئی تھی، اس بوکھلاہٹ میں اور بھی اضافہ ہو گیا، جب اُس نے راجو کو اپنے سامنے دیکھا۔۔۔ ایک دم اُس کی نگاہیں کھڑکی کی طرف اُٹھیں، راجو کی طرف مڑیں، وہاں سے دروازے کی جانب گھومیں اور پھر پھرا کر راجو پر جم گئیں۔۔۔۔۔۔

راجو نے ٹائم پیس کی طرف دیکھا اور کہا۔۔۔۔ میاں جی! بارہ بج گئے ہیں، بی بی جی آپ کو بلاتے ہیں، چائے تیار ہے!

یہ کہہ کر راجو نے ٹائم پیس اُٹھائی اور اس میں کوک بھرنا شروع کر دی۔ کوک بھرنے کے بعد اُس نے تپائی پر سے پانی کا گلاس اٹھایا اور چلی گئی۔۔۔

اس کا کیا مطلب ہے؟۔۔۔ کیا راجو سوداگروں کی نوکری چھوڑ کر یہاں آگئی ہے۔ سعید کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا بات ہے، اس کی ماں غائت درجہ رحمدل تھی، وہ جانتی تھی کہ راجو کا چال چلن اچھا نہیں مگر اس کے باوجود وہ اسے بُرا نہیں کہتی تھی۔ دل کا حال خدا بہتر جانتا ہے لیکن باطن سے جو کچھ عیاں تھا اس سے سعید نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا، کہ اس کی ماں ایک خدا ترس عورت ہے خدا ترسی اس حد تک اس کے دل میں جاگزین تھی یا اس حد تک اس نے خود پر طاری کر رکھی تھی کہ وہ کسی کو بُرا کہہ نہیں سکتی تھی۔ جب وہ سنتی کہ فلاں آدمی نے چوری کی ہے تو کہا کرتی، "بیچارے کو ضرورت نے مجبور کیا ہو گا۔"

راجو کی بُرائیاں سُن کر اُس نے کئی بار کہا تھا، کسی نے آنکھ سے تو اس کی بُرائیاں نہیں دیکھیں، کیا پتہ ہے کہ سب تہمتیں ہی ہوں۔۔۔اللہ سے ہر وقت ڈرنا چاہیئے۔۔۔۔۔۔ہم خود بہت گناہ گار ہیں۔

سعید کی ماں اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی گناہگار عورت سمجھتی تھی۔ایک بار سعید نے مذاق مذاق میں اپنی ماں سے کہا تھا: بی بی جی! آپ ہر وقت کہتی رہتی ہیں، میں گنہگار ہوں، میں گنہگار ہوں! کہیں ایسا نہ ہو فرشتے آپ کو سچ مچ گنہگار سمجھ کر دوزخ میں دھکیل دیں، ہاں یہ تو بتایئے، کیا اس وقت بھی آپ یہی کہے جائیں گی، میں گناہگار ہوں، میں گناہگار ہوں!

اس کی ماں پانچ وقت باقاعدگی کے ساتھ نماز پڑھتی تھی، زکٰوۃ دیتی تھی غرضیکہ وہ تمام باتیں کرتی تھی جو گنہگاروں کو کرنی چاہئیں۔

سعید بہت دیر سوچ بچار کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا، چونکہ میری ماں نماز پڑھنا اور روزے رکھنا پسند کرتی ہے اس لیے خواہ مخواہ اسے اپنے آپ کو گنہگار سمجھنا پڑتا ہے۔اور چونکہ اب نماز روزے کی عادی ہو گئی ہے اس لیے ہر وقت گناہ کا خیال کرنا بھی اسکی عادت میں داخل ہو گیا ہے۔

سعید گناہ اور ثواب کے جھگڑے میں اپنے دماغ کو پھنسانے ہی والا تھا کہ اسے راجو کا خیال آیا جو ابھی ابھی اس کے کمرے سے باہر گئی تھی۔۔۔۔۔دو باتیں ہو سکتی ہیں۔۔۔۔۔۔یا تو وہ سوداگروں کی نوکری چھوڑ کر ہمارے یہاں چلی آئی ہے اور میری ماں نے ثوابوں میں ایک اور ثواب کا اضافہ کرنے کے لیے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہے یا پھر سوداگروں ہی کے پاس ہے اور ویسے ہی اِدھر آنکلی ہے اور جیسا کہ اس کی عادت ہے شیشے کا گلاس اُٹھا کر لے گئی ہے۔جو تپائی پر غیر ضروری ساد کھائی دیتا تھا۔ مگر رات کا واقعہ؟۔۔۔۔۔اس نے راجو کے چہرے پر سے اس واقعہ کے بجھے ہوئے نقش دیکھنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ کوری سلیٹ کی طرف صاف تھا۔

ایک دم سعید کا دل بغیر کسی ناقابل بیان وجہ سے نفرت کے جذبات سے بھر گیا۔اُسے راجو سے نفرت تھی۔وہ اپنے حافظے کی تختی پر راجو کی تصویر کھینچتا تھا۔ہمیشہ ان گھسیلے رنگوں میں جو اُسے راجو کی زندگی میں نظر آتے تھے اسکی صناعانہ طبیعت کو صدمہ پہنچتا تھا۔جب راجو کے پُلو میں وہ چاروں مردوں کو بندھا دیکھتا۔ گوشت اور چھچھڑوں کی صورت

میں،اس سے بھی پہلے وہ کئی بار اسی فیصلے پر پہنچا تھا کہ اسے راجو سے نفرت ہے۔۔۔۔۔۔ مگر یہ چیز اُسے بہت ستاتی تھی کہ راجو کو اپنے آپ سے نفرت نہیں،وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھی۔

ایک مرتبہ سعید سے ایسی حرکت سرزد ہو گئی تھی جو کمینگی کی حد تک بُری تھی۔

مگر جب اس کے ضمیر نے اس کو سرزنش کی تو وہ کئی دنوں نہیں، کئی مہینوں تک اپنے آپ سے متنفر رہا۔اس کا خیال تھا کہ جس طرح لوگ بری حرکتوں پر دوسروں کو ملامت یا نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اسی طرح ایسے موقعوں پر وہ اپنے آپ سے بھی ایسا ہی سلوک کرتے ہیں، مگر راجو یا تو اپنے آپ سے بے خبر تھی یا اس کے اندر وہ حس ہی نہیں تھی جو ترازو کا کام دیتی ہے۔

اس لڑکی کے بارے میں سعید نے اسقدر سوچا تھا کہ اب مزید غور کرنے کے خیال ہی پر اسے بہت غصہ آتا تھا۔وہ اسکے متعلق بالکل سوچنا نہیں چاہتا تھا۔اس لیے کہ اس میں کوئی ایسی انوکھی بات ہی نہیں تھی جس پر غور کیا جاتا۔

وہ ایک نہایت ہی پست عورت تھی۔ سعید اُٹھ کھڑا ہوا اور اس انداز سے اُس نے راجو کو اپنے دماغ سے جھٹکا دیا، جیسے کسی گھوڑے نے اپنے جسم سے تمام مکھیاں ایک ہی جُھرجُھری کے ذریعے سے اُڑا دی ہیں۔اُس نے اب خود کو رت جگے کے اثرات کے باوجود تروتازہ محسوس کیا۔۔۔۔

سُورج کی کرنیں کھڑکیوں کی درزوں میں سے پھنس پھنس کر کمرے کے اندر داخل ہو کر ایسی روشنی پیدا کر رہی تھیں جو شاعرانہ طور پر مصنوعی تھی۔۔۔۔

اُس نے کھڑکیاں نہ کھولیں اور تپائی کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ابھی وہ اپنے آپ کو کرسی میں آرام دہ طریق پر پھیلانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ راجو نمودار ہوئی۔ کچھ کہے بغیر اُس نے ایک ایک کر کے سب کھڑکیاں کھولیں اور جھاڑ پونچھ شروع کر دی۔

سعید اس کی تمام حرکتیں غور سے دیکھتا رہا۔راجو کے موٹے موٹے ہاتھوں کی جنبش میں کوئی نزاکت یا خوبصورتی نہیں تھی۔۔۔ شیشے کے پھولدان کو اُس نے اس طریقے،اسی انداز سے صاف کیا جس طرح لوہے کے قلمدان کو صاف کیا تھا۔ جھاڑن سے اُس نے تصویروں کی گرد پونچھی، آتشدان پر رکھی ہوئی تمام چیزیں صاف کیں مگر آواز پیدا کیے بغیر،وہ چلتی بھی تو اس کے قدموں کی چاپ سُنائی نہیں دیتی تھی۔اور جب باتیں کرتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر بول

رُوئی کے نرم نرم گالوں میں لپٹا ہے کان کے پردوں سے اس کی آواز ٹکراتی نہیں تھی، صرف چھو سی جاتی تھی اس کی حرکت اس کی ہر آواز نے ربڑ سول جوتے پہن رکھے تھے۔ سعید اسے دیکھتا رہا۔۔۔ نہیں! اُسے سُننے کی کوشش کرتا رہا۔

راجو نے گہرے سبز رنگ کا اُونی پل اور پہن رکھا تھا جو کہنیوں پر سے پھٹ رہا تھا۔

یہ پل اور غالباً سوداگر کے سب سے بڑے بیٹے نے اسے دیا تھا۔ اس کے نیچے گرم کپڑے کا کُرتہ تھا جس پر جگہ جگہ میل کے گول گول داغ تھے، کھادی کی شلوار زیادہ استعمال کے باعث شلوار کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے اپنی ٹانگوں پر ایک گہرے رنگ کی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ بہت زیادہ غور سے دیکھنے پر اُس کی شلوار کے پائینچے نظر آتے تھے جو اس قدر کھلے تھے کہ پیر بالکل غائب ہو گئے تھے۔۔۔۔۔

سعید اس کے پائینچوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ راجو مڑی اور یہ کہہ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی: "آپ کی چائے تیار ہے، بی بی آپ کی راہ دیکھ رہی ہیں۔"

سعید کا جی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے کلام کرے مگر جانے کیوں اس نے پوچھ لیا: چائے بنانے کے لیے ان سے کس نے کہا تھا؟

راجو نے پلٹ کر حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ آپ نے۔۔۔ ابھی ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ ہاں تیار کی جائے۔۔۔

سعید کرسی پر سے اُٹھ کھڑا ہوا، بغیر کسی جھجک کے اس نے کبھی ایسا نہیں کہا۔۔۔۔ صبح کی چائے ساڑھے بارہ بجے کون پیتا ہے، اب ناشتہ کروں گا تو دوپہر کا کھانا رات ہی کو کھاؤں گا۔۔۔۔۔ اور رات کا کھانا۔۔۔۔۔ راجو ہنس پڑی۔۔۔ رات کا کھانا صبح کو۔

سعید فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے، جاؤ بی بی جی سے کہہ دو، میں چائے نہیں پیوں گا، کھانا کھاؤں گا۔۔۔ ۔ کھانا تیار ہے کیا؟

راجو اپنے چہرے پر سے ہنسی کے پیدا کردہ اثرات کوشش کے باوجود دُور نہ کر سکی۔ اُس کی سنجیدگی اُس رنگ کے مشابہ تھی جو ٹھنڈے پانی میں گھول کر اُونی کپڑے پر چڑھایا جائے اور نہ چڑھے۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا:

''جی ہاں تیار ہے۔۔۔۔۔میں ابھی بی بی جی سے کہہ دیتی ہوں کہ آپ ناشتہ نہیں کریں گے، کھانا کھائیں گے،، یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''دیکھو'' (سعید نے اُسے روکا) بی بی جی سے یہ کہنا۔۔۔ کہ میں ناشتہ نہیں کروں گا، کھانا کھاؤں گا۔۔۔۔۔ میں رات بھر جاگتا رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا میری نیند کو کیا ہو گیا تھا، گلی میں شور ہو تو مجھے نیند بالکل نہیں آتی۔۔۔۔۔ رات باہر خدا معلوم کیا گڑبڑ ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ہاں میں تو ناشتہ نہیں کروں گا البتہ چائے کی ایک پیالی پی لوں گا اور اس کے بعد کھانا کھاؤں گا، یعنی کہ روز مرہ کے وقت پر۔۔۔۔۔۔بی بی جی کہاں ہیں؟۔ باورچی خانے میں ہیں یا اُوپر دُھوپ تاپ رہی ہیں، لیکن ٹھہرو میں خود معلوم کر لوں گا۔۔۔ لیکن تم تم، یہاں کیا کر رہی ہو، میرا مطلب یہ ہے کہ میرے کمرے کی چیزیں صاف کرنے کے لیے تم سے کس نے کہا تھا، یعنی تم یہاں کیسے آگئی ہو۔۔۔۔ تم تو سوداگروں کے یہاں تھیں۔

ایک ہی سانس میں سعید اتنی باتیں کہہ گیا اور چور نظروں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ سرخی کی ایک ہلکی سی جھلک اس کو نظر آئی تھی، جب اُس نے باہر گلی میں گڑبڑ کی طرف اشارہ کیا تھا، مگر اس کے بعد وہ اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ دیکھ سکا، البتہ ہنسی نے اس کے چہرے پر جو پھیلاؤ سا پیدا کر دیا تھا، ابھی تک اُس کے باقیات نظر آرہے تھے۔

راجو نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے باہر چلی گئی، جیسے اُس سے کچھ پوچھا ہی نہیں گیا۔ اس پر سعید کو بہت غصہ آیا۔ اس میں کوئی کشش نہیں کہ میں نے کچھ پوچھنے کے لیے اس سے باتیں نہیں کیں۔ لیکن، بلکہ یونہی غیر ارادی طور پر کچھ کہتا چلا گیا ہوں، جس میں کوئی ربط نہیں تھا، مگر میری خواہش تھی، خواہش، کیا مجھے پورا یقین تھا کہ وہ گھبرا جائے گی اور رات کا واقعہ اُس کے چہرے کے ہر مسام سے پھوٹ نکلے گا اگر یہ عورت ہے یا۔۔۔۔۔ یا کیا ہے؟

سعید اس کے متعلق بالکل غور کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہو جاتی ہے کہ اسے سوچ بچار کرنا ہی پڑ جاتا۔ یہ عورت اُس کی زندگی میں خواہ مخواہ داخل ہوتی چلی جا رہی تھی۔ یہ داخلہ سعید کو پسند نہیں تھا چنانچہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اُسے اپنے مکان میں رہنے نہیں دے گا۔

جب وہ اپنی ماں سے باورچی خانے میں ملا تو راجو کے بارے میں ارادے کے باوجود کوئی بات نہ کر سکا۔ اس کی ماں نے جو سعید سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتی تھی، چائے کی پیالی بنا کر کہا۔۔۔۔۔بیٹا رات تیرے دشمنوں کو نیند کیوں نہیں

آئی۔ مجھے راجو نے ابھی کہا ہے کہ گلی میں کچھ گڑبڑ تھی، اس لیے تو سو نہ سکا۔۔۔۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں سُنا۔۔۔۔ میں کہتی ہوں اگر تو اِدھر میرے کمرے میں سو جایا کرے تو کیا ہرج ہے۔۔۔۔ مجھے کئی کئی بار رات میں اُدھر تیری طرف آنا پڑتا ہے، میرے پاس سوئے گا تو یہ میری بے چینی تو دُور ہو جائے گی۔۔۔۔۔ لے بابا میں کچھ نہیں کہتی جہاں چاہے سو، اللہ تیرا نگہبان رہے۔۔۔۔۔ لے چائے پی!۔۔۔۔۔۔ میں تجھ سے کچھ نہیں کہتی۔۔۔۔۔

سعید دراصل راجو کے بارے میں کچھ کہنے والا تھا اور اس کی ماں نے سمجھا کہ وہ حسبِ معمول یہ کہے گا:

''بی بی جی! آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں، میں اکیلا ہی سونے کا عادی ہوں۔''

چنانچہ وہ چپ ہو رہا اور اُدھر اُس کی ماں نے اُس کی ضد پر زیادہ بحث نہ کی۔ راجو چولہے کے پاس خاموش بیٹھی رہی۔۔۔۔''

(۴)

سعید کے گھر میں راجو کو نوکری کرتے ایک مہینہ گذر گیا مگر اس عرصے میں ارادے کے باوجود وہ اپنی ماں سے کچھ نہ کہہ سکا کہ اُسے نکال دیا جائے۔

اب فروری کا آغاز تھا۔ سردی آہستہ آہستہ گرمیوں میں حل ہو رہی تھی دن خوشگوار تھے، راتیں خوشگوار تر تھیں، پنجاب میں فروری کا مہینہ بہت سُہانا ہوتا ہے۔ صبح جب وہ سیر کو نکلتا تو ہلکی پھلکی خنک ہوا بہت دیر تک پیتا رہتا۔۔۔۔۔۔۔۔ اُسے ہر شے حسین نظر آتی۔۔۔۔۔۔،

انہی دنوں کا ذکر ہے ایک روز جب وہ کمپنی باغ کی سیر سے گھر واپس آیا تو اُسے اعضا شکنی محسوس ہوئی۔ بستر میں لیٹتے ہی اُسے بخار آ گیا اور پھر زور کا زُکام ہوا۔ کہ اس کی ناک بے حس سی ہو گئی۔۔۔۔۔ دوسرے روز کھانسی شروع ہوئی، تیسرے روز سینے میں درد اور رفتہ رفتہ درجہ حرارت ایک سو پانچ تک پہنچ گیا۔ اُس کی ماں نے پہلے روز ہی ڈاکٹر کو بُلوایا تھا مگر اُس کی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔

یہ عجیب ہے کہ جب سعید کو شدت سے بخار چڑھتا تو اُس کا ذہن غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتا۔ ایسی ایسی باتیں اُس کے دماغ میں آتیں جو ویسے کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ قوتِ فکر اس قدر تیز ہو جاتی اور طبیعت میں اتنی جولانی پیدا ہو جاتی

کہ وہ گھبرا جاتا۔ بخار اُس کے دل و دماغ میں ایک نیا زاویہ پیدا کر دیتا جس کا تصور وہ معمولی حالت میں نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ اُس کے تمام خیالات سان پر لگ کر نکیلے اور تیکھے ہو گئے ہیں۔

بخار کی حالت میں وہ دُنیا کے تمام مسائل پر غور کرتا، ایک نئی روشنی میں، ایک نئے انوکھے انداز میں وہ دنیا کی نکمی سے نکمی چیز پر غور کرتا۔ چیونٹیوں کو اکٹھا کر کے وہ آسمان کے تاروں کے ساتھ چپکا دیتا۔ آسمان کے ستاروں کو توڑ کر زمین پر بکھیر دیتا۔

درجہ حرارت ایک سو پانچ ڈگری سے کچھ اُوپر ہوا تو سعید کا دماغ تاریخ کی ورق گردانی کرنے لگا۔ سینکڑوں اوراق آن کی آن میں اُلٹ گئے، تمام مشہور واقعات اوپر تلے اُس کے کھٹ کھٹ کرتے دماغ میں گذر گئے اور درجہ حرارت کچھ اُوپر چڑھا تو پانی پت کی لڑائیاں، تاج محل کی مرمریں عمارت میں گڈ مڈ ہو گئیں اور قطب صاحب کی لاٹھ (مشہور تاریخی ہیرو) کے کٹے ہوئے بازو میں تبدیل ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ چاروں طرف دُھند ہی دُھند چھا گئی۔

ایک دم زور کا دھماکہ ہوا اور اس دُھند میں سے محمود غزنوی برق رفتار گھوڑے پر سوار اپنے لشکر سمیت باہر نکلا۔۔۔ کئی اُونچے اُونچے پہاڑ کاٹے گئے، کئی وسیع و عریض میدان گھوڑوں کے سموں کے نیچے سے نکل گئے کئی پاٹ دار دریا چشم زدن میں عبور ہو گئے۔۔۔ آخر کار محمود غزنوی کا گھوڑا سومنات کے جگمگ جگمگ کرتے مندر کے سنہرے پھاٹک کے سامنے رُکا۔ کھل جا سم سم۔۔۔۔ محمود غزنوی اندر داخل ہوا۔۔۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ایک سونے کی مورتی کھڑی ہے۔۔۔۔ راجو۔۔۔۔۔ راجو کیسے ہو سکتی ہے۔ محمود غزنوی نے سوچا، راجو آج سے کئی سو سال پہلے کیا سونے کی مورتی تھی؟۔۔۔۔۔ بکواس ہے۔ لیکن وہی آنکھیں تھیں، وہی موٹے موٹے مٹمیلے ہونٹ۔

محمود غزنوی نے گرز اُٹھا کر ایک بار پھر اُس طلائی مورتی کی طرف دیکھا جس کے اعضا راجو ہی کی طرح بھدے تھے۔ چھاتیاں بھی اُس کی ہی چھاتیوں کے مانند موٹی موٹی تھیں۔ محمود غزنوی نے سوچا نہیں نہیں یہ راجو کی مورتی نہیں، کالی ماتا کی ہے، کالی ماتا نہیں ہو گی تو کوئی اور دیوی ہو گی۔

محمود غزنوی للکارا۔۔۔ ”مندر کے سارے پجاری دوزانو ہو گئے اور تمام زر و جواہر اُس کے آگے ڈھیر کر کے اِلتجا کی: مہاراجہ یہ سب مال و دولت لے لے لیکن اس سونے کی مورتی کی طرف نہ دیکھیں۔“

محمود غزنوی نے پہلے زر وجواہر کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھیں تمتما اُٹھیں پھر اس نے سونے کی مورتی کی طرف دیکھا اور اُس کا دل دھڑکنے لگا۔۔۔۔۔۔۔راجو۔۔۔۔۔ محمود غزنوی نے سوچا، یہ کم بخت راجو کہاں سے آگئی، اس کی سلطنت میں اس نام کی عورت کون تھی۔۔۔۔ کیا وہ اُسے جانتا ہے۔۔۔۔ کیا وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ محبت کا خیال آتے ہی محمود غزنوی نے زور کا قہقہہ لگایا۔۔۔۔ محمود غزنوی اور محبت! محمود غزنوی کو اپنے غلام ایازؔ سے محبت ہے۔۔۔۔۔اور ایازؔ، راجو کیسے ہو سکتا ہے۔

محمود غزنوی نے ایک بار پھر سونے کی مورتی کی طرف دیکھا اور بُلند آواز میں پکارا۔۔۔۔۔ "میں بُت شکن ہوں"۔۔۔۔ "بت فروش نہیں" اور یہ کہہ کر اُس نے اپنا وزنی گرز اُٹھایا اور سونے کی مورتی پر پے در پے ضربیں لگانا شروع کردیں۔ گرز جب پیٹ پر لگا تو وہ پھٹ گیا اور اُس میں سے شہاب الدین کی کھیر اور فالودہ نکلنے لگا۔ محمود غزنوی نے جب یہ دیکھا تو گرز اُٹھا کر اپنے سر پر دے مارا۔

سعید کا سر پھٹ رہا۔ محمود غزنوی کے سر پر جو گرز پڑا تھا اُس کا دھما کہ اُس کے سر میں گونج رہا تھا۔ جب اُس نے کروٹ بدلی تو چھاتی پر کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی چیز رینگتی محسوس ہوئی۔ سومنات اور اُس کی سونے کی مورتی اُس کے دماغ سے نکل گئی۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ اُس نے اپنی گرم گرم آنکھیں کھولیں۔ راجو فرش پر بیٹھی پانی میں کپڑا بھگو بھگو کر اُس کے ماتھے پر لگا رہی تھی۔

جب راجو نے ماتھے پر سے کپڑا اُتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سعید نے اُس کو پکڑ لیا اور اپنے سینے پر رکھ کر ہولے ہولے پیار سے اپنا ہاتھ اُس پر پھیرنا شروع کردیا۔ اُس کی سُرخ آنکھیں دو انگارے بن کر دیر تک راجو کی طرف دیکھتی رہیں، راجو اُس کی ٹکٹکی کی تاب نہ لا سکی اور ہاتھ چھڑا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اس پر وہ بستر میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا "راجو" راجو۔۔۔اِدھر میری طرف دیکھ، محمود غزنوی۔۔۔۔ اس کا دماغ بہکنے ہی والا تھا کہ اُس نے قوتِ ارادی سے کام لیا اور محمود غزنوی کا خیال جھٹک کر کہنے لگا: ادھر میری طرف دیکھو، جانتی ہو، میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ بہت بُری طرح تمہاری محبت میں گرفتار ہوں۔ اُسی طرح میں تمہاری محبت میں پھنس گیا ہوں جس طرح کوئی دلدل میں پھنس جائے۔۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں تم کیا ہو۔۔۔۔ میں جانتا ہوں تم محبت کے قابل نہیں ہو، مگر میں یہ جانتے بوجھتے تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔۔ لعنت ہو مجھ پر۔۔۔۔ لیکن چھوڑو ان باتوں کو۔

۔۔۔ادھر میری طرف دیکھو، خدا کے لیے مجھے تکلیف نہ دو، میں بخار میں اتنا نہیں پھنک رہا جتنا کہ تمہاری محبت میں پھنک رہا ہوں راجو۔۔۔۔راجو۔۔۔۔میں۔۔۔میں" اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اُس نے ڈاکٹر کمند لال بھاٹیہ سے کونین کے نقصانات پر بحث شروع کر دی۔

ڈاکٹر بھاٹیہ ! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں، یہ کونیں بہت زیادہ نقصان دہ چیز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ عرصہ کے لیے ملیریا کے جراثیم مار دیتی ہے مگر نیچرل طور پر بیماری رفع نہیں کر سکتی۔اس کے علاوہ اس کی تاثیر بے حد خشک اور گرم ہے، میرے کان بند ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔میرا دماغ بند ہو گیا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دماغ اور کانوں میں سیاہی چوس کاغذ ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ میں اب ہرگز کونیں کا ٹیکا نہیں لگواؤں گا اور غزنوی بُت شکن۔۔۔۔۔۔سومنات۔۔۔۔۔سومنات کی ایسی کی تیسی۔۔۔۔۔راجو۔۔۔۔راجو تم سومنات نہیں جاؤ گی۔۔۔۔میرے ماتھے پر ہاتھ رکھو۔۔۔۔۔اُف۔۔۔۔اُف۔۔۔یہ کیا بیہودگی ہے۔۔۔۔میں۔۔۔۔میں میرے دماغ میں بے شمار خیالات آ رہے ہیں۔ بی بی جی !آپ حیران کیوں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔مجھے راجو سے محبت ہے۔۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔اُس راجو سے جو سوداگروں کے ہاں نوکر تھی۔۔۔۔اور جواب آپ کے پاس ملازم ہے۔ آپ نہیں جانتے کہ اس عورت نے مجھے کتنا ذلیل بنا دیا ہے۔اس لیے کہ میں اس کے عشق میں گرفتار ہوں۔ یہ محبت نہیں خسرہ ہے۔۔۔۔۔بخدا خسرے سے بھی بڑھ کر ہے۔اس کا کوئی علاج نہیں، مجھے تمام ذلتیں برداشت کرنا ہوں گی، ساری گلی کا کوڑا اپنے سر پر اُٹھانا ہو گا۔ گندی موری میں ہاتھ ڈالنے ہوں گے۔یہ سب کچھ ہو کے رہے گا۔۔۔۔۔۔یہ سب کچھ ہو کے رہے گا۔ آہستہ آہستہ سعید کی آواز کمزور ہوتی گئی اور اُس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں نیم واہ تھیں، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پلکوں پر بوجھ سا آپڑا ہے۔راجو پلنگ کے پاس بیٹھی اس کی بے جوڑ ہذیانی گفتگو سنتی رہی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔۔۔۔۔۔وہ ایسے بیماروں کی کئی مرتبہ تیمارداری کر چکی تھی۔۔۔۔۔۔۔،

بخار کی حالت میں جب اُس نے اپنی محبت کا اعتراف کیا تو راجو نے کیا محسوس کیا۔۔۔۔۔۔اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ اُس کا گوشت بھرا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ بہت ممکن ہے اُس کے دل کے گوشے میں سرسراہٹ پیدا ہوئی ہو۔ مگر چربی کی تہوں سے نکل کر یہ سرسراہٹ باہر نہ آسکی۔

اُس نے رومال نچوڑ کر تازہ پانی میں بھگویا اور اُس کے ماتھے پر رکھنے کے لیے اُٹھی۔ اب کی بار اُسے اس لیے اُٹھنا پڑا کہ سعید نے کروٹ بدل لی تھی، جب اُس نے آہستہ سے سعید کا سر ادھر موڑ کر اس کے ماتھے پر گیلا رومال جمایا تو اُس کی نیم وا آنکھیں یوں کھلیں جیسے لال لال زخموں کے منہ ٹانکے ادھڑ جانے پر کھل جاتے ہیں۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے راجو کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا جس پر گال تھوڑے سے نیچے لٹک آئے تھے اور ایکدم اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر سعید نے اس زور سے اپنی چھاتی کے ساتھ بھنچا کہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی کڑ کڑ بول اُٹھی۔ اُٹھ کر اُس نے راجو کو اپنی رانوں پر لٹا دیا اور اُس کے موٹے اور گدگدے لبوں پر اس زور سے اپنے تپتے ہوئے ہونٹ پیوست کر دیئے جیسے وہ گرم گرم لوہے سے ان کو داغنا چاہتا ہے۔۔۔۔،

سعید کی گرفت اس قدر زبردست تھی کہ راجو کوشش کے باوجود خود کو آزاد نہ کرا سکی۔ اس کے ہونٹ دیر تک اس کے لبوں پر استری کرتے رہے پھر ہانپتے ہوئے دفعتاً اُس نے راجو کو ایک جھٹکے سے الگ کر دیا اور اُٹھ کر یوں بیٹھ گیا جیسے اس نے کوئی نہایت ہی ڈراونا خواب دیکھا ہے راجو ایک طرف سمٹ گئی، وہ سہم گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ابھی تک اس کے پٹپری جمے ہونٹ رڑک رہے تھے۔

راجو نے اُس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا تو وہ اس پر برس پڑا، تم یہاں کیا کر رہی ہو، جاؤ جاؤ، یہ کہتے کہتے سعید نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، جیسے وہ گر پڑے گا، اس کے بعد وہ لیٹ گیا اور ہولے ہولے بڑبڑانے لگا۔ راجو مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، مجھے کچھ معلوم نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اور کیا کر رہا ہوں، بس صرف ایک بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے تم سے دیوانگی کی حد تک محبت ہے۔۔۔ اوہ میرے اللہ۔۔۔ ہاں مجھے تم سے محبت ہے، اس لیے نہیں کہ تم مجھ سے محبت کرنے کے قابل ہو، اس لیے نہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو،۔۔ پھر کس لیے۔۔۔ کاش کہ میں اس بات کا جواب دے سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اس لیے کہ تم نفرت کے قابل ہو، تم عورت نہیں ہو، ایک سالم مکان ہو، ایک بہت بڑی بلڈنگ ہو، مجھے لیکن تمہارے سب کمروں سے محبت ہے، اس لیے کہ وہ غلیظ ہیں۔ ٹُوٹے ہوئے ہیں۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے کیا یہ عجیب بات نہیں؟۔۔۔ یہ کہہ کر سعید نے ہنسنا شروع کر دیا۔

راجو خاموش رہی، اس پر ابھی تک سعید کی گرفت اور اُس کے خوفناک بوسے کا اثر تھا۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر جانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اُس نے پھر ہذیانی کیفیت میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ راجو نے اُس کی طرف دھڑکتے ہوئے دل سے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ کسی غیر مرئی آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔۔۔ تم ظالم ہو۔۔۔ انسان نہیں حیوان ہو، مان لیا کہ وہ بھی تمہاری طرف حیوان ہے، مگر پھر بھی عورت ہے۔۔۔۔ عورت اگر پاش پاش بھی ہو جائے ،جب بھی عورت رہتی ہے۔۔۔۔ لیکن تم یہ باتیں کبھی نہیں سمجھو گے۔ بھینس میں اور عورت میں تم کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ لیکن خدا کے لیے جاؤ اور اُسے اندر لے آؤ باہر سردی میں کپڑوں کے بغیر اس کا سارا خون جم گیا ہو گا۔ میں پوچھتا ہوں آخر اس کے ساتھ تمہاری لڑائی کس بات پر ہوئی۔۔۔۔ لالٹین کے نیچے وہ صرف تمہارا بنیان پہنے کھڑی ہے اور تم۔۔۔۔ تم۔۔۔۔ لعنت ہو تم پر۔۔۔۔۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو، راجو عورت ہے۔۔۔ پشمینے کا تھان نہیں جسے تم چرخ چڑھاتے رہو۔۔۔۔۔،

پہلی مرتبہ راجو کو معلوم ہوا کہ اُس رات والے واقعہ سے بی بی کا لڑکا واقف ہے۔ چنانچہ وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ لوگ اس کے اور چار سوداگر بھائیوں کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے تھے، مگر وہ جانتی تھی کہ کسی نے بھی اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا۔ اُس لیے وہ کبھی خوفزدہ نہیں ہوتی تھی لیکن اب یہاں اس کے سامنے بستر پر وہ آدمی لیٹا تھا جو کہ بہت کچھ دیکھ اور سن چکا تھا۔ اس آدمی کے متعلق آج تک اُس نے غور نہیں کیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ میاں غلام رسول مرحوم کا یہ لڑکا کسی سے بھی زیادہ باتیں نہیں کرتا اور سارا دن اپنی بیٹھک میں موٹی موٹی کتابیں پڑھتے رہنا اس کا شغل ہے اور بس، گلی کے دوسرے لڑکوں کے بارے میں ہر روز نئی نئی باتیں سنتی تھی لیکن اُس کے متعلق اس نے تقریباً یہی سُنا تھا کہ بڑا بد مزاج ہے۔ اور میاں غلام رسول مرحوم سے بھی زیادہ اسے اپنے خاندانی ہونے پر گھمنڈ ہے، اس کے سوا وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر آج اُسے معلوم ہوا کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے اور ،اور اس سے محبت بھی کرتا ہے۔۔۔۔،

اس کی محبت کا انکشاف راجو کے لیے تکلیف دہ نہیں تھا۔ اُس کو دراصل یہ بات بڑی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ اُس نے سب کچھ دیکھ لیا، یہ بڑی شرم کی بات تھی، چنانچہ اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ بی بی جی کا لڑکا وہ تمام واقعہ بھول جائے۔ اُس نے تھوڑی دیر اپنے دماغ پر زور دیا اور آخر کار ایک طریقہ سوچ کر اُس نے کہنا شروع کیا: خدا قسم۔۔۔

اللہ قسم۔۔۔ پیر دستگیر کی قسم یہ سب جھوٹ ہے، میں مسجد میں قرآن اُٹھانے کے لیے تیار ہوں کہ جو کچھ آپ سمجھتے ہیں، بالکل غلط ہے، میں نے اپنی مرضی سے سوداگروں کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ وہاں کام بہت زیادہ تھا اور اس روز رات کو بھی اس بات کا جھگڑا تھا، میں دن رات کیسے کام کر سکتی ہوں۔ چار نوکروں کا کام، مجھ اکیلی جان سے کیسے ہو سکتا ہے، میاں جی۔

سعید بخار میں بے ہوش پڑا تھا۔ راجو جب اپنے خیال کے مطابق تمام ضروری باتیں کہہ چکی تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا، لیکن اُس نے سوچا کہ ایک ہی سانس میں اُس نے جتنی جھوٹی قسمیں کھائی ہیں، شاید ناکافی ہیں چنانچہ اُس نے پھر کہا: ''میاں جی پاک پروردگار کی قسم۔۔۔۔۔۔ مرتے وقت مجھے کلمہ نصیب نہ ہو اگر میں جھوٹ بولوں۔۔۔۔۔ یہ سب بہتان ہے، میں کوئی ایسی ویسی تھوڑی ہوں، مجھ سے زیادہ کام نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے میں نے ان کو چھوڑ دیا۔۔۔ ۔۔۔اب اتنی سی بات کا بتنگڑ بن جائے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔''

یہ کہنے کے بعد اس نے گویا اپنا فرض ادا کر دیا اور قریب تھا کہ کمرے سے باہر چلی جائے کہ سعید نے آنکھیں کھولیں اور پانی مانگا۔ راجو نے بڑی پھرتی سے پانی کا گلاس اُس کے ہاتھ میں دے دیا اور واپس ہی کھڑی رہی تاکہ گلاس واپس لے کر اسے تپائی پر رکھ دے۔

ایک ہی گھونٹ میں گلاس کا سارا پانی پینے کے بعد اس کی پیاس کو تھوڑی بہت تسکین ہوئی، خالی گلاس راجو کے ہاتھ میں دے کر اُس نے نگاہیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہو گیا اور تکیئے پر سر رکھ کر لیٹ گیا!

اب وہ ہوش میں تھا۔ اُس نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے راجو کو مخاطب کیا: ''راجو''

راجو نے دبے ہوئے لہجے میں جواب دیا: ''جی''

''دیکھو، بی بی جی کو یہاں بھیج دو''

یہ سُن کر راجو نے خیال کیا کہ وہ بی بی جی کو رات کی ساری داستان سُنانا چاہتا ہے، چنانچہ اس نے پھر قسمیں کھانا شروع کیں: ''میاں جی! قرآن مجید کی قسم۔۔۔۔ اللہ پاک کی قسم، اور کوئی بات نہیں تھی۔۔۔۔ میرا ان سے صرف اسی بات پر جھگڑا ہوا تھا کہ میں زر خرید لونڈی نہیں کہ دن رات کام کرتی رہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ نے میری زبان سے اس کے سوا اور کیا سُنا تھا؟

سعید نے بستر پر بڑی مشکل سے کروٹ بدلی۔ ٹھنڈے پانی نے اس کے تمام جسم میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑادی تھی۔ راجو کی طرف حیرت سے دیکھ کر اُس نے پوچھا: ''کیا کہہ رہی ہو تم'' پھر فوراً ہی جب اُسے خیال آیا کہ ہذیانی کیفیت میں اُس سے بے شمار باتیں کر چکا ہے اور اپنی محبت بھی اس پر ظاہر کر چکا ہے۔ تو اُسے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ ملیریا کے باعث اُس کے منہ کا ذائقہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ اب اس غلطی کے احساس نے اُس کے منہ میں اور زیادہ کسیلا پن پیدا کر دیا اور اُس کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

''مجھے راجو سے باتیں نہیں کرنا چاہئیں تھی۔۔۔۔۔ راجو پر اپنی محبت کا اظہار تو قطعی طور پر کرنا نہیں چاہیے تھا، اس لیے کہ وہ اس کی اہل ہی نہیں۔ میں نے راجو کو اپنے دل کا راز نہیں بتایا بلکہ اپنے تمام وجود کو ایک گندی موری میں پھینک دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھ سے یہ غلطی ہوئی، لیکن اگر میں کوشش کرتا تو جذبات کے دھارے کو روک سکتا تھا۔ مگر مجھ میں اتنی طاقت ہے۔۔۔۔۔ مگر افسوس کہ اس بات کا خیال ہی نہ آیا۔ اور میں بکتا چلا گیا''۔

جو کچھ وہ راجو سے کہہ چکا تھا۔ اُس کا لفظ لفظ تو سعید کو یاد نہیں تھا، لیکن وہ سوچ سکتا تھا کہ اُس نے کیا کہا ہو گا۔ وہ اس سے پہلے عالم خیال میں راجو سے کئی مرتبہ گفتگو کر چکا تھا۔ اور ہر بار ندامت محسوس کر چکا تھا مگر اب وہ سچ مچ اس سے ہمکلام ہوا تھا۔ اور اس پر اپنی محبت بھی ظاہر کر چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس کو وہ راز بتا چکا تھا جس سے وہ خود کو بھی غافل رکھنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ یہ سعید کی زندگی کا عظیم ترین حادثہ تھا۔

راجو سامنے کھڑی تھی۔ ملیریا اپنے برفیلے ہاتھ پھر اس کے جسم پر پھیر رہا تھا۔ ایک نہایت ہی ناگوار کپکپاہٹ اُس کے رگ وریشہ کے اندر کنکھجورے کی مانند رینگ رہی تھی۔ اور اُس کے دل میں ایسی تلخی پیدا ہو رہی تھی، جو اُس نے اِس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک دم اُسے اتنا بخار چڑھے کہ بیہوش ہو جائے تاکہ جو کچھ ہو چکا ہے اُس کا احساس کچھ عرصے کے لیے اُس سے دُور رہے۔

بڑی مشکل سے اُس نے خود کو راجو سے یہ کہنے پر آمادہ کیا:

''جاؤ بی جی کو یہاں بھیج دو۔۔۔۔ میں یہاں مر رہا ہوں، کچھ میرا تو خیال کریں۔ اس پر راجو نے ہولے سے کہا: آپ ہی کے لیے سو نفل پڑھ رہی ہیں، میں جا کر دیکھتی ہوں ختم ہوئے ہیں کہ نہیں۔۔۔۔،،

جاؤ۔۔۔۔خدا کے لیے جاؤ۔۔۔۔۔۔یہ کہہ کر سعید نے لحاف اپنے منہ پر بھی اوڑھ لیا اور سردی کی شدت کے باعث جو ملیریا کے تازہ حملے کا نشان تھی، زور زور سے کانپنا شروع کر دیا۔
راجو کمرے سے باہر چلی گئی۔

(۵)

"سردی چونکہ بہت شدت کی تھی"
اس لیے بد احتیاطی کے باعث سعید کو نمونیہ ہو گیا اور اس کی حالت بہت نازک ہو گئی۔ اس کی ماں بیچاری کیا کر سکتی تھی۔ دن رات دعائیں مانگنے میں مصروف رہتی اور اپنے بیمار بیٹے کے پاس بیٹھی رہتی۔ راجو نے بھی تیمار داری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مگر بجائے آرام کے اُس کی خدمت سے مریض روحانی اذیت محسوس کرتا رہا۔۔۔۔،
سعید کے دل میں کئی مرتبہ آئی کہ اپنی ماں سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دے کہ راجو کی موجودگی پسند نہیں کرتا، مگر کوشش کے باجود ایسا نہ کر سکا، چنانچہ اس اذیت میں جو کہ وہ محسوس کر رہا تھا، اُس شکست کے باعث اور بھی اضافہ ہو گیا۔۔۔
ڈاکٹر کمند لال بھاٹیہ نے یہ رائے دی تھی کہ اُسے ہسپتال میں داخل کر دیا جائے تو ٹھیک رہے گا۔ وہاں پر تیمار داری بھی اچھی طرح ہو سکے گی، اور دوا وغیرہ بھی وقت پر دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ضرورت کے وقت اچھے سے اچھا ڈاکٹر بھی مل سکے گا لیکن اس کی ماں رضا مند نہیں ہوتی تھی۔ ہسپتال سے اُسے سخت نفرت تھی۔ لیکن جب اُس کے چہیتے بیٹے نے خود ہسپتال داخل ہونے پر اصرار کیا تو وہ دل پر پتھر رکھ کر خاموش ہو گئی۔ اُس نے اپنے بیٹے کی آج تک کوئی بات نہیں ٹالی تھی۔ چنانچہ نمونیہ ہونے کے دوسرے روز ہی ڈاکٹر کمند لال بھاٹیہ اُسے بڑی احتیاط سے سول ہسپتال میں لے گیا اور وہاں اسپیشل وارڈ میں داخل کرا دیا۔۔۔،
ہسپتال میں سعید چند دنوں کے اندر اندر ہی ٹھیک ہو گیا۔ نمونیہ کا حملہ کافی زبردست تھا مگر وہ بچ گیا اور بخار وغیرہ بھی دُور ہو گیا۔ ہسپتال کے کمرے میں جس کی ہر چیز سفید تھی، اُس کو روحانی تسکین حاصل ہوئی۔ چونکہ راجو وہاں نہیں تھی، اس لیے اُس کے دل پر جو بوجھ سا آپڑا تھا، بہت حد تک ہلکا ہو گیا اور وہ مکمل صحت کی بڑی شدت سے خواہش کرنے

لگا۔۔۔۔ لیکن یہ طے تھا کہ گھر میں نہیں رہے گا، جہاں راجو موجود تھی، وہ اس عورت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو دیکھ کر اُس کے دل و دماغ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جس سے وہ پہلے بالکل نا آشنا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اُس کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو گیا تھا، مگر وہ اس محبت کو بالکل دبا دینا چاہتا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ کام بہت مشکل تھا مگر وہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کر رہا تھا اور اُس نے خود کو اس دوران میں۔۔ آہستہ آہستہ اس بات کا یقین بھی دلا یا تھا کہ راجو کو بھول کر وہ ایک ایسے معرکے کا کام کرے گا جو آج تک کوئی نہیں کر سکا۔

ہسپتال میں داخل ہونے کے آٹھویں روز کمزوری اور نقاہت کے باوجود سعید بہت تر و تازگی محسوس کر رہا تھا۔ صبح سویرے جب سفید پوش نرس نے اُس کا ٹمپریچر لیا تو اس نے مسکرا کر کہا: ''نرس، میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔ کاش میں اس کا صلہ تم سے محبت کر کے دے سکتا''۔ اینگلو انڈین نرس کے لبوں پر ایک باریک مسکراہٹ پھیل گئی۔ آنکھوں کی پتلیاں نچا کر اُس نے کہا: ''تو کیوں نہیں کرتے۔۔۔۔ کرو''

اُس نے بغل سے تھرما میٹر نکال کر نرس کو دیا اور جواباً کہا: ''میں اپنے دل کے کواڑ ہمیشہ کیلیے بند کر چکا ہوں۔ تم نے اُس وقت دستک دی ہے جبکہ صاحب خانہ ہمیشہ کے لیے اپنی کوٹھڑی میں سو گیا ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ تم اس قابل ہو کر تم سے آئیڈوفارم کے تیز بُو سمیت محبت کی جائے، مگر اٹ از ٹو لیٹ مائی ڈیر!''

نرس ہنس پڑی اور یوں معلوم ہوا کہ ہار کا دھاگہ ٹُوٹنے سے موتی ادھر اُدھر بکھر گئے ہیں۔ اس کے دانت بہت سفید اور چمکیلے تھے۔۔۔۔۔

سعید نرسوں کی کمزوری سے واقف تھا چنانچہ اُس نے بڑے پُر لُطف انداز میں کہا: ''نرس تم ابھی پوری طرح جوان کہاں ہوئی ہو۔۔۔۔ شباب آنے دو، ایک چھوڑ پوری درجن محبتیں تمہارے ارد گرد چکر لگانا شروع کر دیں گی۔۔۔۔۔ لیکن اس وقت مجھے ضرور یاد کر لینا، جس نے ہسپتال کے اس کمرے میں ایک بار تمہاری پنڈلیوں کی تعریف کی تھی۔ اور کہا تھا۔ اگر چار ہوتیں تو میں اپنے پلنگ میں پایوں کی بجائے لگوا لیتا۔

نرس نے تختی پر ٹمپریچر نوٹ کیا اور ''یو نوٹی بوائے'' کہہ کر اپنی پنڈلیوں کی طرف داد بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

سعید بہت خوش تھا یایوں سمجھیے کہ وہ اپنے آپ کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دراصل وہ راجو کو کسی نہ کسی حیلے سے بھول جانا چاہتا تھا۔ کئی بار اُس کو اِس گفتگو کا خیال آتا، جو اُس نے بخار کی حالت میں اُس سے کی تھی۔ مگر فوراً ہی دوسرے خیالوں کے نیچے اُسے دبا دیتا۔

ہسپتال میں اب اُسے مزید چار روز رہنا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نمونیہ اور ملیریا نے اس کی بہت سی طاقت لوٹ لی تھی۔ مگر اسے اپنی کمزوری کا بالکل خیال نہیں تھا۔ بلکہ اُلٹا خوش تھا۔ اب اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت سا غیر ضروری بوجھ اس پر سے اُٹھ گیا ہے۔ خیالات میں اب وہ پہلا سا کھچاؤ نہیں تھا اور نہ پراگندگی ہی تھی۔ بخار اور نمونیہ نے فلٹر کا کام دیا تھا وہ محسوس کرتا تھا کہ اب اس میں وہ بھاری پن نہیں رہا جو اُسے پہلے تنگ کرتا رہا ہے۔ بخار نے اُس کے نوکیلے جذبات کو گھسا دیا تھا، اس لیے اب اُسے چبھن محسوس نہیں ہوتی تھی!

دماغ بالکل ہلکا تھا۔ باقی اعضا بھی ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ جس طرح دھوبی میلے کپڑے کو پھٹک پھٹک اُجلا کرتا ہے۔ اسی طرح بخار نے اچھی طرح جھنجوڑ کر نچوڑ کر اس کا سارا میل نکال دیا تھا۔

جب نرس اپنی پنڈلیوں کی طرف دیکھتی ہوئی باہر نکلی تو سعید دل ہی دل میں مسکرایا۔ پھر اُس نے سوچا نرس کی پنڈلیاں واقعی خوبصورت ہیں۔ دوسرے مریضوں کے لیے ایسے چار دن گذارنا بہت مشکل تھا۔ مگر سعید نے بڑے مزے سے یہ دن کاٹے۔ شام کو اُس کے دوست آجاتے تھے اُن سے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا۔ صبح کو اُس کی ماں آتی جو اپنی ممتا سے اُس کا دل خوش کر جاتی، دوپہر کو سورہتا اور بیچ میں جب اُس کے پاس کوئی نہ ہوتا تو رسالے پڑھتا رہتا جن کا انبار اب کھڑکی کی سل پر جمع ہو گیا تھا۔

جب اُس کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو ڈاکٹر، نرس، خدمتگار اور ہسپتال کے ایک دو اور ملازمین اُس کے کمرے میں جمع تھے۔ دو بھنگی انعام لینے کے لیے کھڑے تھے۔ باہر پھاٹک پر تانگہ کھڑا تھا۔ جس میں اُس کا ملازم غلام نبی بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے وہ لندن جا رہا ہے یا لندن سے واپس آ رہا ہے اور اس کے دوست احباب اس کو خیر باد کہنے یا اس کا استقبال کرنے کے لیے جمع ہیں۔

نرس اُس سے بار بار کہہ رہی تھی: "آپ نے اپنی سب چیزیں یاد سے اٹیچی میں رکھ لی ہیں نا؟" اور وہ بار بار اس کا جواب دے رہا تھا۔

"جی ہاں! رکھ لی ہیں"۔

نرس پھر کہتی تھی: "وہ آپکی گھڑی کہاں ہے۔۔۔دیکھیے گدے کے نیچے ہی نہ پڑی رہے؟"

اس پر اُسے کہناپڑتا: "میں نے گھڑی اُٹھاکر اپنی جیب میں رکھ لی ہے" اور آپ کا فونٹن پن؟"

"وہ بھی میری جیب میں ہے"

اور آپ کی عینک؟

"وہ بھی میری ناک پر ہے، آپ اطمینان کر سکتی ہیں"۔

اس پر نرس مسکرادیتی۔

نرس نے سعید کی بہت خدمت کی تھی جیسے ننھے منے بچے کا کوئی خیال رکھتا ہے، اسی طرح وہ سعید کا خیال رکھتی تھی، اور اب کہ وہ ہسپتال سے جارہا تھا۔ وہ اس کو یوں رخصت کر رہی تھی، جیسے ماں بچے کو سکول بھیجتی ہے اور اس کے دروازے سے باہر نکلنے تک کبھی اس کی ٹوپی ٹھیک کرتی رہتی ہے یا کبھی اُس کی قمیص کے بٹنوں کو بند کرتی رہتی ہے۔

نرس کی اس قسم کی خدمت نے اُس پر بہت اثر کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے ہمیشہ پُر لُطف طریقے پر گفتگو کرتا تھا۔

جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تو سعید نرس سے مخاطب ہوا۔

"نرس! دیکھنا میری ٹائی کی ناٹ کیسی ہے؟"

نرس نے ٹائی کی گرہ کی طرف دیکھا، مگر فوراً ہی سمجھ گئی کہ اُس سے مذاق ہو رہا ہے۔ چنانچہ مسکرادی۔۔۔ بالکل ٹھیک ہی ہے، مگر آپ اپنا آئینہ یہیں بھولے جارہے ہیں۔

یہ کہہ کر وہ کمرے کی آخری کھڑی کی طرف بڑھی جس کے پاس ہی لوہے کا نعمت خانہ رکھا تھا۔ اُسے کھول کر اُس نے آئینہ نکالا اور سعید کے اٹیچی کیس میں رکھ کر کہا: "کیوں جناب ایک چیز تو آپ بھول ہی گئے تھے نا۔۔۔۔"

اس پر سعید نے کہا: "اب مجھے کیا معلوم کہ آئینے بھی پھلوں اور دُودھ کی طرح نعمت خانے میں رکھے جاتے ہیں۔ میں نے اُسے وہاں نہیں رکھا۔۔ آپ نے کبھی اس کی مدد سے اپنے ہونٹوں پر سُرخی لگائی ہو گی اور وہ بھی اس وقت جبکہ میں سو رہا ہوں گا۔

اِس قسم کی پُر لُطف باتوں کے بعد اس نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔ چند کاغذات پر دستخط کیے۔ نرس وغیرہ کا شکریہ ادا کیا اور خیراتی بکس میں کچھ روپے ڈال کر اُس کمرے سے باہر نکل آیا جہاں اُس نے پورے پندرہ روز بیماری کی حالت میں گزارے تھے۔

جب باہر سڑک کی جانب نکلا تو اُس نے ایسے ہی مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا جدھر اُس کے کمرے کی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ تین کھڑکیاں بند تھیں مگر ایک کھلی تھی، جس میں سے نرس جھانک رہی تھی۔ جب ان دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو نرس نے اپنا ننھا سا رومال لہرایا اور کھڑکی بند کر دی۔۔۔۔ اس کے دوست عباس نے جب یہ تماشہ دیکھا تو آنکھ مار کر رشید سے کہا:

"بھئی مجھے کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے"۔

(۲)

پندرہ دنوں کی غیر حاضری کے بعد جب سعید گھر میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اسے راجو نظر آئی جو دوڑی دوڑی بڑے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر رُک گئی اور تتلا تتلا کر کہنے لگی: "میاں جی!۔۔۔ آپ ٹھیک ہو گئے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہو گئے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں پانچ روپے کے پیسے لینے جا رہی ہوں۔۔۔۔"، یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور سعید نے اطمینان کا سانس لیا۔ آگے بڑھا تو اُس کی ماں نے اس جھٹ چھاتی سے لگا لیا اور چٹ چٹ بلائیں لینا شروع کر دیں۔

سعید کو اپنی ماں کے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے پیار سے بہت اُلجھن ہوتی تھی مگر اب کہ اُس کی طبیعت میں ایک قسم کی نرمی پیدا ہو گئی تھی اُسے ماں کی محبت کا جوش اچھا معلوم ہوا اور اُس نے فرحت محسوس کی۔

جب گھر میں داخل ہوا تو اُس کے ساتھ مہمانوں کا سا سلوک کیا گیا۔ نئے ٹی سیٹ میں چائے دی گئی۔ اندر کمرے میں نیا فرش بچھایا گیا تھا۔ کرسیوں پر نئی گدیاں دھری تھیں، پلنگ پر وہ چادر بچھی ہوئی تھی جس پر اُس کی ماں نے بڑی محنت سے تار کشی کا کام کیا تھا۔ ہر شے قرینے سے رکھی گئی تھی اور کمرے میں ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جو مسجد میں جمعہ کی نماز پر دیکھنے میں آیا کرتی ہے۔۔۔۔ جب بہت سے آدمی نہا دھو کے اُجلے کپڑے پہنے ہوتے ہیں۔

چائے پی کر وہ دیر تک اپنی ماں کے پاس بیٹھا رہا۔ گلی کی سب عورتیں ایک ایک کر کے آئیں اور سعید کی صحت یابی پر اُس کی ماں کو مبارک باد دے کر چلی گئیں۔ جب فقیروں کو پانچ روپے کے پیسے بانٹنے کا وقت آیا اور گلی میں شور مچ گیا تو سعید اُٹھ کر اپنی بیٹھک میں چلا آیا۔

غلام نبی نے کمرہ خوب صاف کر رکھا تھا سب کی سب کھڑکیاں کھلی تھیں اس کی والدہ کو معلوم تھا کہ وہ اپنے ہی کمرے میں جا کر بیٹھے گا۔ سگریٹ کا نیا ٹن تپائی پر رکھا تھا۔ اور پاس ہی نئی ماچس پڑی تھی۔

جب کمرے میں داخل ہوا تو اُس نے اپنی تمام چیزوں کا جائزہ لیا ہر شے اپنی اپنی جگہ پڑی تھی۔ اس کبوتر تک جو بارہ بجے تک اس کے باپ کی بڑی تصویر کے بھاری فریم پر اونگھتا رہتا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ صاف کی ہوئی دری پر ننگے پیر ٹہلتا رہا۔ اتنے میں اس کے دوست آنا شروع ہو گئے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھایا گیا جو کہ پرہیزی تھا، مگر ہسپتال کی خوراک سے بدرجہا بہتر! کھانے کے بعد سگریٹ کا دور چلا اور دیر تک گپ بازی ہوتی رہی، اسی دوران میں عباس نے کہا "اماں" ہسپتال کی وہ لونڈیا بری نہیں تھی۔۔۔ رشید نے مسکرا کر کہا، آپ کا ڈبل نمونیہ بغیر دوا کے یونہی تو اچھا نہیں ہو گیا۔ بعض نرسیں امرت دھارا ہوتی ہیں۔

عباس کو رشید کی بات بہت پسند آئی۔ واللہ کیا جملہ ہے۔۔۔ نرس اور امرت دھارا۔۔۔ میں سمجھتا ہوں۔۔۔ سعید آدھی بوتل تو ختم کر دی ہو گی تم نے۔۔۔؟ بھئی، ایسی دوائیں بے دردی سے استعمال نہیں کی جاتیں۔۔۔ سعید کو یہ واہیات گفتگو اچھی معلوم ہوئی، چنانچہ اس نے بھی اس میں حصّہ لینا شروع کر دیا کیا خیال ہے۔ تمہارا ہسپتال میں اس جیسی تیکھی نرس شاید ہی کوئی اور ہو۔۔۔۔ بھئی ہسپتال والوں کی نبض شناسی کی داد دینا پڑتی ہے کہ انھوں نے مس فریا کو میری خدمت پر مامور کیا۔ یوں تو اس شہر میں کسی عورت کی ننگی ٹانگ نظر ہی نہیں آتی اور اب تو سردی زوروں پر ہے، سب ٹانگیں موٹے موٹے غلافوں میں رہتی ہیں اس لیے اُس کی ننگی پنڈلیوں نے بڑی فرحت بخشی۔۔۔۔ لیکن تم نے اُس کی پنڈلیاں نہیں دیکھیں!

عباس بولا! "کیا مشہور مقامات میں شامل کرنے کے لائق ہیں؟"

اس پر سعید دفعتہً سنجیدہ ہو گیا، بھئی مذاق بر طرف، مگر اُس نے میری بہت خدمت کی ہے، بچہ سمجھ کر میری تیمارداری کرتی تھی، معمولی سے معمولی چیز کا خیال رکھتی تھی، بعض اوقات میرا منہ بھی دھلاتی تھی۔ ناک میں پونچھتی تھی، جیسے

میں بالکل اپاہج ہوں۔ میں اس کا بہت احسان مند ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کو ایک ساڑھی تحفہ کے طور پر بھیج دُوں۔ ایک بار اُس نے کہا تھا کہ اُسے ساڑھی پہننے کا بہت شوق ہے، کیوں عباس تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔۔۔؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ، مگر شرط یہ ہے کہ ساڑھی میں لے کر جاؤں گا۔۔۔۔۔ طے ہے، اور یہ بھی طے ہے کہ ساڑھی سفید ہو گی کیونکہ یہ رنگ مجھے پسند ہے۔۔۔۔"

چنانچہ دوسرے روز گوکل کی مارکیٹ سے عباس اور سعید نے ایک سفید رنگ کی ساڑھی منتخب کی جس کے کنارے کنارے ایک سفید تلے کا بورڈ دوڑ رہا تھا۔ قیمت ادا کر دی گئی اور ایک چٹ پر اپنا اور نرس کا نام لکھ کر اسے ساڑھی کے ساتھ چپکا دیا گیا۔ عباس نے بکس بند کیا اور اُسے لے کر ہسپتال روانہ ہو گیا۔ جانے سے پہلے سعید نے عباس سے کہا: "مگر دیکھو، ہسپتال میں جا کر تحائف دینا ٹھیک نہیں"۔ عباس نے کمرے سے باہر نکل کر جواب دیا۔ میں نرسوں کے گھر جا رہا ہوں ہسپتال میں تو بیمار جاتے ہیں۔

عباس چلا گیا اور شام کو واپس آیا، جب سعید چائے وائے پی کر اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر ادھر مردانے کی طرف آ رہا تھا۔ دروازے پر جب دستک ہوئی۔ اور "خواجہ صاحب" کی آواز بلند ہوئی تو اُس نے سمجھ لیا کہ عباس ہے اور کوئی دلچسپ خبر لایا ہے، جب دونوں اطمینان سے کمرے میں بیٹھ گئے تو باتیں شروع ہوئیں۔ عباس نے گفتگو کا آغاز کیا:

"بھئی مجھے ایسا شک ہوتا ہے کہ اسے تم سے بہت بُری طرح محبت ہے اور وہ دن بھر تمہارے فراق میں آہیں بھرتی رہتی ہے۔ رات کو سو نہیں سکتی، وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔"

"ارے بھئی نہیں، تم مذاق مت سمجھو۔ اُس نے خود تو کچھ نہیں کہا مگر میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے، جانے تم نے اس پر کیا جادو کر دیا ہے؟"

"میں پوری بات تو سُن لوں۔۔۔؟"

میں وہاں گیا۔ اُس کا ٹھکانا معلوم کیا، وہ ڈیوٹی پر نہیں تھی، اس لیے اس نے مجھے اپنے چھوٹے سے کمرے میں بُلا لیا اور میرے آنے کی وجہ پوچھی، میں نے ساڑھی کا بکس اُس کو دے دیا۔ اُسے کھول کر جب اُس نے ساڑھی دیکھی تو اُس کی آنکھوں میں نمی پیدا ہو گئی، کہنے لگی۔۔۔۔ ناحق تکلیف کی، مگر مجھے یہ ساڑھی پسند ہے، اُن کا ذوق بہت اچھا ہے۔ گو سفید کپڑے پہن پہن کر میں سفید رنگ سے اُکتا سی گئی ہوں، مگر اس میں ایک خاص بات ہے۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ یہ

بوڈر کتنا پیارا ہے، اگر بڑا ہوتا تو ساری خوبصورتی ضائع ہو جاتی، میری طرف سے اُن کا بہت بہت شکریہ ادا کیجیے گا۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ لیکن وہ آپ کیوں نہیں آئے۔۔۔۔۔ یعنی اُنھیں خود آنا چاہیے تھا، یہ کہتے کہتے وہ رک سی گئی اور بات کا رُخ بدل دیا۔

آپ نے بھی کافی زحمت اُٹھائی ہے۔۔۔ مجھے آپ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیئے تھا۔۔۔۔۔،

یہ سُن کر سعید نے عباس سے پوچھا، مگر اس گفتگو سے کیا ثابت ہوتا ہے، کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔،

ارے بھئی میرے بتانے سے کیا ثابت ہو گا، میں مس فریا نہیں ہوں، تم ہوتے تو وہی نتیجہ اخذ کرتے جو میں نے کیا ہے، اور پھر اُس نے یہ بھی تو کہا۔ ان سے کہیئے گا کہ کہ وقت بے وقت جب ادھر کمپنی باغ کی طرف آنکلیں تو مجھے ضرور ملیں۔ میرے کمرے کا نمبر آپ اُن کو بتا دیجیے گا، اس لیے انھیں تکلیف نہ ہو گی۔۔۔ لیکن ٹھہریئے۔۔۔؟

تمھیں معلوم ہے اس کے بعد اُس نے کیا کہا؟

""تم سے کہا ہو گا تشریف لے جایئے""

اُس نے چھوٹے سے پیڈ پر تمھیں ایک خط لکھا، لیکن تھوڑی دیر سوچ کر اُسے پھاڑ دیا۔ پھر ایک نیا لکھا، اُسے بھی پھاڑ دیا اور میری طرف بیوقوفوں کی مانند دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگی، سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔۔۔۔ یہ کہہ کر اُس نے پھر کوشش کی جو بارآور ثابت ہوئی، بڑی سوچ بچار کے بعد اُس نے ایک خط لکھا، اُسے لفافے میں بند کر کے مجھے دیا اور کہا: یہ اُن کو دے دیجیے گا، میں یہ خط لے کر باہر نکلا اور۔۔۔۔ سعید نے پوچھا کہا ں ہے؟

عباس نے بڑی بے پرواہی سے جواب دیا میرے پاس۔۔۔۔۔ ہاں تو میں نے باہر آکر لفافے کو دیکھا، اس پر لکھا تھا، پرائیویٹ، چنانچہ میں نے کھول لیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔،

""تم نے کھول لیا۔۔۔۔؟""

کھول لیا! اور پڑھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ آپ سے ملنے کے لیے بہت بیقرار ہے، خط کا مضمون یہ ہے! میں تم سے ملنا چاہتی ہوں میری طبیعت آج کل بہت اُداس ہے، ساڑھی کا بہت بہت شکریہ، میں اسے پرسوں کھیل میں پہن کر جاؤں گی جو چھاؤنی میں ہو رہا ہے۔

یہ کہہ کراُس نے جیب میں ہاتھ ڈالااور نکال کر سعید کو دے دیا، تم خود بھی پڑھ لو۔ شاید بین السطور میں تمہیں کوئی اور عبارت نظر آجائے،،

سعید نے لفافہ کھول کر پڑھا، وہی مضمون تھا جو عباس نے سُنایا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مس فریا نے انگریزی میں چار سطریں لکھی تھیں، جن کا ترجمہ عباس نے کر دیا۔۔۔،

یہ خط پڑھ کر سعید سوچ میں پڑ گیا۔۔۔۔ وہ مجھ سے کس لیے ملنا چاہتی ہے اور اُداس کیوں ہے۔ کیا اُداسی مجھ سے ملاقات کرنے پر دُور ہو جائے گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کی طبیعت میں اُداسی کرنے والا میں ہوں۔ کیا یہ سچ عباس کے کہنے کے مطابق وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔

اس آخری خیال پر اُسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ عباس تم نرے کھرے بیوقوف ہو، اُسے مجھ سے محبت نہیں ہوئی بلکہ کسی اور سے ہوئی ہے اور مجھے اس کا سارا حال سُنانا چاہتی ہے۔ میں نے اس سے ایک بار مذاق مذاق میں کہا تھا: جونہی تم کسی سے محبت کرنے لگو، مجھے ضرور بتانا۔ ممکن ہے کیوپڈ نے اُس کے سینے پر اپنا پہلا تیر چلا دیا ہو، خیر چھوڑو اس قصے کو، یہ بتاؤ کہ تم نے کسی اینگلوانڈین لڑکی سے محبت کی ہے؟

عباس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ میں نے ٹھیٹ یورپین لڑکی سے لے کر بھنگن تک سب سے محبت کی ہے مگر یہ محبت فریق ثانی تک کبھی نہیں پہنچ سکی۔۔۔۔ سچ پوچھو تو میں تمہاری اس فریا ہی سے محبت کرنے لگا ہوں مگر اس قسمت کا کیا کروں، جیسا کہ تم کہتے ہو، وہ کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اپنا سلسلہ یونہی چلتا رہے گا، آخر ایک روز شادی ہو جائے گی۔۔۔۔۔ اور چلو چھٹی ہوئی۔

عباس افسردہ ہو گیا۔ اس پر سعید نے پوچھا، عباس تم واقعی کسی سے محبت کرنا چاہتے ہو؟

عباس تڑپ کر بولا: یہ واقعی محبت کی بھی خوب رہی، ارے بھئی ایک زمانہ ہو گیا ہے کوشش کرتے کرتے اور اب تو محبت کی خواہش بہت شدت اختیار کر گئی ہے۔ کوئی بھی ہو، مگر عورت ہو عورت، خدا کی قسم مزا آجائے؟

یہ کہہ کر عباس نے مزا لینے کی خاطر زور زور سے اپنے ہاتھ ملنا شروع کر دیے۔ لیکن میں ایسی محبت کا قائل نہیں جو دق یا سل کے روگ کی طرف ہمیشہ کے لیے چمٹ جائے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک یا دو برس تک عورت سے عشق کر سکتا ہوں۔ اور بس، اس سے زیادہ عشق کرنا میرے نزدیک جہالت ہے غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے کہ مصری کی مکھی بہ بنو،

شہد کی مکھی بنو، تو بھئی میں تو شہد کی مکھی ہوں۔۔۔۔۔اپنا تو یہی اصول ہے، چاہے عشق ہو نہ ہو مگر یہ اصول نہیں بدلے گا۔ شادی الگ رہے اور عشق جدا ہوں۔۔۔واللہ اگر ایسا ہو جائے تو کیا کہنے ہیں، لیکن مجھے ایسے لگتا ہے کہ بس اب کسی سے عشق کرنے میں کامیاب ہونے ہی والا ہوں۔ ایک قلعہ سر ہو گیا تو بس سارا جرمنی میرا ہے، مجھے یہ سیگفرلائن توڑنی ہے، جس روز ٹوٹ گئی بیڑا پار سمجھو۔۔۔۔،

عباس کی تقریر سن کر سعید نے اپنے اور اُس کے عشق کا موازنہ کیا۔ زمین و آسمان کا فرق تھا۔ لیکن ایک بات ضرور تھی کہ عباس نے دوسرے آدمیوں کی طرح اپنے جسمانی عشق پر پردہ نہیں ڈالا تھا، اُس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ایک یا دو برس سے زیادہ کسی عورت سے عشق کرنا حماقت سمجھتا ہے۔۔۔۔۔

عشق کتنی دیر قائم رہتا ہے، یہ سعید کو معلوم نہیں تھا، میعادی بخار کیطرح کیا اس کی مدت محدود ہے، یہ بھی اس کے علم میں نہیں تھا۔ محرقہ بخار اس کو ایک بار چڑھا تھا جو اُس کی ماں کے کہنے کے مطابق سوا مہینے تک رہا تھا۔ لیکن یہ عشق جو ابھی ابھی اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ کب تک اسے تکلیف دیتا رہے گا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں پیدا ہوا ہی تھا کہ راجو اور اس کے ارد گرد کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے گھومنے لگیں اور وہ اس آدمی کی طرح جو اچانک کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے، سخت گھبرا گیا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو ان خیالات سے آزاد کرانے کی خاطر عباس سے کہا:۔

"عباس آج کوئی پکچر دیکھنا چاہیے۔"

عباس جس کے دماغ میں عشق بسا ہوا تھا، کہنے لگا، خالی تصویریں پیاس نہیں بجھا سکتیں دوست۔۔۔مجھے عورت چاہیے عورت۔۔۔ گرم گرم گوشت والی عورت جس کے گالوں پر میں اپنی محبت کے سرد توس سینک سکوں۔ تمہیں ایک موقعہ مل رہا ہے، بخدا اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ جاؤ وہ نرس تمہاری ہے۔۔۔۔۔

واللہ تمہاری ہے۔ اُس کی آنکھوں نے مجھے بتادیا تھا، کہ وہ ایک غلطی کر کے رونا چاہتی ہے۔ جاؤ اُس کو اپنی زندگی کی پہلی غلطی میں مدد دو۔۔۔۔بیوقوف نہ بنو۔ اگر غلطیاں نہ ہوتیں تو عورتیں بھی نہ ہوتیں۔۔۔۔۔میری سمجھ میں نہیں آتا تمہارا فلسفہ کیا ہے۔ بھئی ایک جوان لڑکی تمہارے ذریعہ سے اپنی زندگی کا فسانہ رنگین بنانا چاہتی ہے۔ تم اگر اپنا رنگوں کا

بکس بند کرلو تو یہ تمہاری حماقت ہے۔۔۔۔ کاش تمہاری جگہ پر میں ہوتا۔ پھر، پھر دیکھتے کیسے کیسے شوخ رنگ اُس کی زندگی میں بھرتا۔۔۔۔۔!

عباس کی تقریر سعید ان کانوں سے سننے کی کوشش کر رہا تھا جن میں راجو کی محبت بھنبھنا رہی تھی۔ ہسپتال میں وہ اس کو قریب قریب بھول چکا تھا مگر اب پہلے ہی دن گھر میں آکر وہ پھر اُس کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ عباس باتیں کر رہا تھا اور اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ اُٹھے اور اندر جا کر راجو کو ایک بار دیکھ کر پھر آئے۔ اُس کی طرف محبت بھری نظروں سے نہ دیکھے۔ نفرت آلود نگاہوں ہی سے دیکھے، مگر دیکھے ضرور، مگر اُس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جو اِرادہ وہ کر چکا ہے، اتنی جلدی فنا ہو جائے۔

چنانچہ بڑی قوت سے کام لے کر اُس کے خیال کو ایک بار پھر اُس نے اپنے دل کے اندر کچل دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ "عباس کوئی اور باتیں کرو۔۔۔۔۔ سچ پوچھو تو میں محبت کا صحیح مطلب ہی ابھی تک نہ سمجھ سکا۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ محبت وہ چیز نہیں ہے جس کا ذکر تم کرتے ہو۔ تم ایک عورت سے صرف ایک دو برس تک محبت کرنے کے قابل ہو مگر میں تو عمر بھر کا پٹہ لکھوانا چاہتا ہوں۔

اگر مجھے کسی سے عشق ہو جائے تو میں اس پر اپنی ملکیت چاہتا ہوں۔ وہ عورت ساری کی ساری میری ہونی چاہیے۔ اُس کا ایک ایک ذرّہ میری محبت کے ماتحت ہونا چاہیے۔ عاشق اور ڈکٹیٹر میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ دونوں طاقت چاہتے ہیں۔ دونوں حکمرانی کی آخری حد کے خواہش مند ہیں۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔ تم محبت محبت پکارتے ہو۔ میں خود محبت محبت کہتا ہوں، لیکن اس بارے میں ہم کتنا جانتے ہیں۔۔۔ کسی اندھیرے غار میں یا باغ کی کسی گھنی جھاڑی کے پیچھے اگر تمہاری کسی شہوت کی بھوکی عورت سے ملاقات ہو جائے تو کیا تم کہو گے، میں نے عشق لڑایا ہے، میری زندگی میں ایک رومان داخل ہو گیا ہے۔ غلط ہے، بالکل غلط ہے۔ یہ محبت نہیں۔ محبت کچھ اور ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ محبت ایک نہایت ہی پاک جذبے کا نام ہے۔ اور جیسا ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ اس میں شہوت بالکل ملوث نہیں ہونی چاہیے۔ میں اس کو بھی نہیں مانتا، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے معلوم ہے، محبت کیا ہے۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ مگر میں واضع طور پر اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکتا، میں سمجھتا ہوں، محبت ہر شخص کے اندر ایک خاص انفرادیت لے کر پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک فعل کا تعلق ہے ایک ہی رہتا ہے، عمل بھی ایک ہی ہے۔ نتیجہ بھی عام طور پر ایک ہی جیسا نکلتا

ہے، لیکن جس طرح روٹی کھانے کا فعل بظاہر یکساں ہے اور بہت سے آدمی جلدی جلدی نوالے اُٹھاتے ہیں اور بغیر چبائے ان کو نگل جاتے ہیں، اور بعض دیر تک چبا چبا کر لقمے کو اپنے معدے میں داخل کرتے ہیں، لیکن یہ مثال بھی واضح طور پر کچھ بیان نہیں کر سکتی۔ بھئی میرا دماغ خراب ہو جائے گا خدا کے لیے یہ محبت کی باتیں ختم کرو۔ ہماری محبت بہت سے پتھروں کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ جب کھدائی ہو گی اور اس کو نکالا جائے گا تو ہم دونوں اس کے متعلق اچھی طرح بات چیت کر سکیں گے۔

سعید کی اس ناہموار تقریر میں اتنے دھچکے تھے کہ عباس کے دماغ میں ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جو تھرڈ کلاس تانگے میں بیٹھ کر شکستہ سڑک پر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ جانے تم نے کیا بکواس کی ہے مگر میں صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور زمین کا خریدنا تمہارے لیے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے کے بجائے ایک دو بیگہ زمین خرید لو اور اس پر ساری عمر قابض رہو۔۔۔۔ لاحَول وَلا۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ تمہارے اندر شاعری کا کیا ہوا۔۔۔۔ بیمار رہنے کے بعد تم اتنے کور ذوق کیوں ہو گئے ہو۔ بھئی اتنی معمولی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ عشق جو زیادہ دیر تک قائم رہے، عشق نہیں، لعنت ہے۔۔۔۔۔۔ ہم انسان ہیں، فرشتے نہیں کہ ایک ہی حور پر قانع ہو کر رہ جائیں۔ اگر ایک ہی عورت سے میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے چپکا دیا تو زندگی اجیران ہو جائے گی۔۔۔۔۔ میں خودکشی کر لوں گا۔۔۔۔۔، زندگی میں صرف ایک عورت۔۔۔۔۔۔ صرف ایک۔۔۔۔ اور یہ دنیا کیوں اس قدر بھری ہوئی ہے۔۔۔۔۔؟ کیوں اس میں اتنے تماشے جمع ہیں۔۔۔۔۔۔۔ صرف گندم پیدا کر کے ہی اللہ میاں نے اپنا ہاتھ کیوں نہ روک لیا۔

میری سنو اور اس زندگی کو جو کہ تمہیں دی گئی ہے اچھی طرح استعمال کرو کہ تم اس عورت کو جو تمہارے راستے میں ڈال دی گئی ہے، کچھ دنوں کے لیے کیونکر خوش کر سکتے ہو۔۔۔۔۔ اپنی خوشی مقدم ہے۔۔۔۔۔۔۔؟

فلسفے میں خود کو نہ اُلجھاؤ، عورت کوئی ناقابل فہم مخلوق نہیں ہے۔ یوں تو تم اپنے پالتو کتے کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، لیکن اس کو سمجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جب تک وہ تمہارے پچکارنے پر اپنی کٹی ہوئی دُم ہلاتا رہتا ہے اور تمہارے کہنے پر گیند دبوچ لیتا ہے، میں پوچھتا ہوں عورت کے متعلق زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا ہے، وہ اگر اتھا

سمندر رہے تو ہوا کرے اور اونچا تارا ہے تو اس سے کیا جب تک وہ عورت ہے اور ان خوبیوں کی مالک ہے جو عورت میں ہونی چاہئیں، صرف ایک ہی بات پر غور کرنا چاہیے کہ اسے کیونکر حاصل کیا جا سکتا ہے؟

یہ تقریر سننے کے بعد سعید نے عباس سے دفعتہً پوچھا:

"لیکن عورتیں ہیں کہاں۔۔۔۔؟"

عباس نے ڈبے سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور جواب دیا۔ یہاں، وہاں، ادھر، اُدھر، ہر جگہ عورتیں موجود ہیں۔ کیا اس گھر میں کوئی عورت موجود نہیں ہے؟ وہ تمہاری نوکرانی راجو کیا بری ہے، جس نے اُس دن تمہاری بیٹھک کا دروازہ میرے لیے کھولا تھا۔ تم میری طرف یوں آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو، بھئی ہمیں عورت چاہیے اور راجو سو فی صد عورت ہے۔ وہ تمہاری نوکر سہی لیکن اس سے اُس کی نسوانیت میں تو کچھ فرق نہیں آتا۔۔۔ مانتا ہوں کہ ہمارے یہاں اکثر عورتیں صندوقوں میں بند ہیں، لیکن اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ جو صندوقوں میں بند ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ جو صندوقوں سے باہر ہیں، ان کی طرف ہم توجہ دینا چھوڑ دیں۔۔۔۔ دستر خوان پر جو کچھ حاضر ہو کھانا ہی پڑے گا۔ یہ کہہ کر عباس نے زور سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور اپنے دوست سعید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر وہ نظریں ملانا نہیں چاہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے اس بات کا ڈر ہے کہ عباس اُس کی آنکھوں میں راجو کی محبت کا سارا قصہ پڑھ لے گا۔ چنانچہ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ انگیٹھی کی سل پر اپنی تصویر کے فریم کو ذرا ادھر ہٹا کر اُس نے عباس سے کہا:۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ کچھ نہیں، تمہاری گفتگو بہت گھناؤنی ہے۔۔۔۔ تم بات کرتے ہو اور مجھے منہ سے خون کی بو آتی ہے۔ تم لہو پینے والے انسان ہو۔ "اور تم" عباس نے پھر سگریٹ کی راکھ جھاڑی، تم؟۔۔۔۔ میں لہو پینے والا انسان ہی سہی، لیکن تم جیسے دودھ پینے والے جانوروں سے بدرجہا اچھا ہوں۔ تم نیکی اور بدی کے بیچ میں لٹکے ہو۔۔۔ شکر ہے کہ میں ایسی چمگادڑ نہیں، میں ایک طوفانی سمندر رہوں۔ تم خشکی پر کھڑے ہو۔۔۔ میں شاعر ہوں۔ تم ایک خشک نثر نویس، تم ایک ایسے گاہک ہو جو عورت کو حاصل کرنے کے لیے ساری عمر سرمایہ جمع کرتے رہو گے، مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔

میں ایسا خریدار ہوں جو زندگی میں کئی عورتوں سے سودے کرے گا۔ تم ایسا عشق کرنا چاہتے ہو کہ تمہاری ناکام موت پر کوئی ادنیٰ درجے کا مصنف ایک کتاب لکھے جسے نرائن دت سہگل لال پیلے کاغذوں پر چھاپے اور ڈبی بازار میں ایک ایک

آنے میں تمہاری محبت کا افسانہ بکے۔۔۔۔۔۔ میں اپنی کتاب حیات کے تمام اوراق دیمک بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔۔۔۔۔۔ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو۔۔۔۔۔ میں زندگی میں محبت چاہتا ہوں۔ میں سب کچھ ہوں۔۔۔۔ لیکن تم کچھ بھی نہیں ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ذرا سوچو تو آخر تم ہو کیا۔

تھوڑی دیر کے لیے سعید کو محسوس ہوا کہ عباس واقعی سب کچھ ہے اور وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس نے سوچا کہ آخر میں کیا ہوں۔ یہاں اس گھر میں ایک لڑکی موجود ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں، لیکن، لیکن یہ محبت کیا ہے۔ کیس ذلت آفریں چیز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ میری ہو جائے لیکن پھر ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس کے خیال تک کو نوچ کر پھینک دُوں۔۔۔۔۔۔۔ میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔۔۔۔۔ کیا محبت اسی مصیبت کا نام ہے؟

وہ بزدل ہو گیا تھا۔۔۔۔۔۔ عباس اپنے خیال میں مگن تھا، اس لیے وہ اپنے دوست کی دلی کیفیت نہ تاڑ سکا۔ دراصل وہ دوسروں کی ذات پر غور کرنے کا عادی بھی نہ تھا۔ اسے صرف اپنی ذات سے دلچسپی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے ہی اندر سمایا رہتا تھا۔ اسے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ دوسروں کی بابت غور کرے۔ لیکن اس کے باوجود اچھا دوست تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ دوستی اور اس کے معنی پر غور ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا، اماں چھوڑو، تم کن وہموں میں گرفتار ہو گئے ہو۔ دوستی، دوستی سب بکواس ہے، دیہات یا پتھر کے زمانے میں دوست ہوا کرتے ہوں گے۔ آج کل کوئی کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔ لوگ اگر دوستی ہی کی رسی بٹنا شروع کر دیں تو سارے کا سارا کاروبار بند ہو جائے۔۔۔۔۔۔ تم مجھے دوست کہتے ہو، کہو، میں تمہیں دوست کہتا ہوں، ٹھیک ہے، سنتے جاؤ، مگر اس سے زیادہ غور نہ کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ ۔۔۔ جتنا زیادہ غور کرو گے، اتنے ہی زیادہ گڑھے پیدا ہوتے جائیں گے۔ آج دُنیا میں جتنی سیاہ کاریاں ہو رہی ہیں سب اسی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔

قتل ہوتے ہیں زیادہ سوچ بچار کے باعث، چوریاں ہوتی ہیں زیادہ سوچنے کی وجہ سے، ڈاکے پڑتے ہیں زیادہ فکر و تردد کرنے سے۔۔۔۔ دماغ اور بارود کی میگزین میں کوئی فرق نہیں۔ اور سوچ بچار چقماق پتھر سے جھڑی چنگاریاں ہیں۔۔۔۔۔۔۔ گاودی، بیوقوف اُلو ہو جاؤ، مگر خدا کے لیے عقلمند اور منکر نہ بنو؟۔

عباس بہت مزید ار باتیں کرتا تھا۔ معمولی سی بات کو بھی ایک خاص رنگ میں دلچسپ طریقے پر پیش کرنے کا عادی تھا۔ دنیا کے بارے میں اُس کے بنائے ہوئے چند اصول تھے۔ جس پر وہ ایک عرصے سے نہایت پابندی کے ساتھ چل رہا تھا۔۔۔۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ فکر و تردو سے پرہیز کرتا تھا، لیکن ان باتوں پر اسے تھوڑے عرصے کے لیے غور کرنا ہی پڑتا تھا۔ جو اس کی اپنی ذات سے متعلق ہوتی تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔اس وقت بھی وہ کسی بات پر غور کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے پر اطمینان کی وہ لہر نہیں تھی جو عام طور پر نظر آیا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔۔نیا سگریٹ سلگا کر وہ بڑے زور سے کش لے رہا تھا اور اس کا دوست سعید آتش دان کے پاس ایک زبردست ذہنی اور رُوحانی کشمکش میں مبتلا تھا۔

دفعتاً عباس چونک پڑا:

''اجی ہٹاؤ، خواہ مخواہ اس اُلجھن میں اپنے آپ کو کیوں پھنسایا جائے جو ہوگا دیکھا جائے گا،،۔۔۔۔۔اپنے دوست سے مخاطب ہو کر پھر اس نے کہا: اجی حضرت! آپ کن وہموں میں گرفتار ہو گئے ہیں، کرسی پر تشریف رکھیے۔۔۔۔آپ ابھی ابھی بیماری سے اُٹھے ہیں، ایسا نہ ہو پھر ہسپتال جانا پڑے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن دوست اس دفعہ اپنی جگہ مجھے دینا، واللہ وہ لونڈیا مجھے بھا گئی ہے۔

یہ کہہ کر وہ خود آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

سعید آتش دان کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ زیادہ بات چیت اور سوچ بچار نے اُسے کمزور کر دیا تھا۔ چنانچہ تھکی ہوئی آواز میں اُس نے عباس سے کہا:

''عباس! میں بہت کمزور ہو گیا ہوں، میرا خیال ہے کچھ دنوں کے لیے کہیں باہر چلا جاؤں، تبدیلی آب و ہوا ہو جائے گی،،

عباس نے پوچھا کہاں جاؤ گے؟

سعید نے جواب دیا:۔۔۔۔۔۔ ''کہاں جاؤں گا، یہی تو سوچ رہا ہوں۔۔۔۔سردیوں میں کہاں جانا چاہیے۔۔۔کوئی ایسی جگہ بتاؤ، جہاں موسم معتدل ہو؟

بمبئی چلا جاؤں۔۔۔۔ کلکتہ بھی بُرا نہیں لیکن۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ کرسمس تو گزر چکا، کرسمس کو چھوڑو۔۔۔۔۔ تو بمبئی چلا جاؤں۔۔۔۔ دراصل میں کچھ دنوں کے لیے امرتسر کو بھول جانا چاہتا ہوں۔۔۔۔ یہاں مجھے وحشت سی ہو رہی ہے۔

عباس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا:

"امرتسر سے آپ کو وحشت ہو رہی ہے؟ یا وحشت۔۔۔۔امرتسر نے آپ کو کہاں کاٹ کھایا تھا۔"

اس پر سعید کے دل میں آئی کہ عباس سے اپنا سارا راز کہہ دے، مگر خاموش رہا، وہ چاہتا تھا کہ کسی کو اپنا رازدار بنائے مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے راز سے واقف ہو۔ اگر یوں ہوتا کہ راز فاش کرنے پر بھی اُس کا راز فاش نہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنا دل عباس کے سامنے کھول دیتا۔ مگر اُسے معلوم تھا کہ ایک بار اُس نے راجو سے محبت کی داستان سنا دی تو وہ چڑیا پھر سے اُڑ جائے گی جس کو وہ پنجرے ہی میں مار ڈالنا چاہتا ہے۔ چونکہ عباس کو اپنا رازِ دل سنانے کے لیے وہ آگے جھکا تھا۔ اس لیے اُسے ڈبے سے سگریٹ نکال کر سُلگانا پڑا۔ عباس تاڑ گیا کہ اُس کا دوست کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر کہہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اُس نے اُس کے اندر جرأت پیدا کرنے کو کہا: بات کو زیادہ دیر تک پیٹ میں نہ رکھا کرو! سعید ہاضمہ خراب ہو جائے گا، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا کوئی خاص بات ہے۔۔۔۔ خاص بات تو کوئی بھی نہیں ہوتی۔۔۔۔ ہم اور تم خواہ مخواہ باتوں میں خاص پن پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ کہو کیا کہنا چاہتے تھے تم۔۔۔۔؟

سگریٹ کا ایک کش لے کر سعید نے عباس سے کہا:

"کچھ بھی نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں خود نہیں سمجھ سکا، میں امرتسر کیوں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ دراصل کچھ عرصے سے مجھے رُوحانی کوفت محسوس ہو رہی ہے، میں شوروغل میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"شوروغل میں رہنا چاہتے ہیں آپ، تو یہ کیا مشکل ہے، میں اسی کمرے میں آپ کے لیے شوروغل پیدا کر سکتا ہوں۔ فرمایئے شوروغل کی آپ کو ضرورت ہے! رشید، وحید، ناصر، پران، سب آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں گے۔ اتنا شور برپا ہوا کرے گا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے گی۔۔۔

فرمایئے کیا حکم ہے؟

عباس ہنسنے لگا تو سعید بے چین ہو گیا۔ عباس کو معلوم نہیں تھا کہ سعید کے اندر ایسا طوفان برپا ہے اور وہ کن کن عذابوں میں سے گزر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ ہنستے ہوئے عباس نے ایک بار پھر پوچھا:

''فرمایئے کیا حکم ہے ؟''

اس پر سعید اور بے چین ہو گیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اس ہفتے کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ میں بہت اُداس ہو گیا ہوں میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ بس ایک دو مہینے باہر رہ کر جب میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو واپس آجاؤں گا۔ مجھے یہاں کونسے ضروری کام کرنے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔۔۔۔ عباس مسکرایا:

''لیکن مجھے تو بہت سے ضروری کام کرنے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔''

کیا۔۔۔۔؟

ایک ہو تو بتاؤں، سینکڑوں ہیں، مثال کے طور پر مجھے ایک دو لڑکیوں سے عشق لڑانا ہے اور اینگلوانڈین لڑکیوں سے بات چیت کرنے کے سارے آداب سیکھنے ہیں۔ کچھ تھوڑے سے بازاری قسم کے مذاق بھی ازبر یاد کرنے ہیں اور دس بیس سستے ناول پڑھنے ہیں ؟ اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ لیکن میں تمہیں اپنے پروگرام کیوں بتاؤں۔۔۔۔ تم جاؤ، میں یہاں اپنی دلچسپی کا سامان پیدا کروں گا۔۔۔۔ خط لکھتے رہنا۔۔۔۔ لیکن جاؤ گے کہاں۔۔۔۔۔؟

سعید نے سوچا کہ واقعی وہ جائے گا کہاں ایسی کونسی جگہ تھی، جہاں وہ آرام سے رہ سکتا تھا۔ ہوٹلوں میں رہنا اُسے پسند نہیں تھا اور رشتہ داروں کے یہاں قیام کرنا اُسے ویسے ہی ناپسند تھا۔ کیونکہ اُس کی آزادی میں خلل آتا تھا یہ سب باتیں اُس کے ذہن میں تھیں، مگر امر تسر چھوڑ دینے کی خواہش لحظہ بہ لحظہ شدت اختیار کر رہی تھی۔ وہ خود جانا چاہتا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ راجو کو نکال دینے کا خیال تک اُس کے دماغ میں پیدا نہ ہوا۔

اُس روز وہ کوئی ارادہ نہ کر سکا، لیکن یہ طے تھا کہ وہ کہیں چلا جائے گا۔

(۷)

امرتسر سے لاہور میں تیس بتیس میل حائل ہیں، ایک گھنٹے میں سست سے سست رفتار ٹرین بھی آپ کو امرتسر سے لاہور پہنچا دیتی ہے۔ لیکن جب سعید امرتسر چھوڑ کر لاہور چلا آیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ہزاروں میل اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہے اور اب اُسے راجو کا ڈر نہیں رہا۔

ماں نے اُس کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا اور ہسپتال سے گھر واپس آنے کے چوتھے روز ہی اپنا مختصر اسباب لے کر چل دیا۔ لاہور میں اُس کے تین چار رشتہ دار تھے، اُن سے ملا مگر اُن کے یہاں قیام نہ کیا۔ وہ رشتہ دار بھی اس کی چنداں پروانہ کرتے تھے۔

سعید اُن کے اِس سلوک سے بہت خوش تھا۔ مہمانوں کی طرح چند گھنٹوں کے لیے ہر ایک کے پاس ٹھہرا اور رسمی گفتگو کرنے کے بعد اپنے ہوٹل میں چلا آیا:

اس ہوٹل سے اُس کا جی ایک ہفتے کے بعد ہی اُکتا گیا۔ ویسے کرایہ بھی زیادہ تھا۔

اور وہ ان آدمیوں میں گھرا ہوا نہیں رہنا چاہتا تھا جو ہندوستان میں پیدا ہو کر یورپین بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے مال روڈ پر اپنے لیے ایک چھوٹا سا کمرہ دیکھ لیا اور کرایہ ورایہ طے کر کے اس میں اُٹھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ہوٹل کا بل وغیرہ ادا کر کے وہ تانگے میں اسباب رکھوا رہا تھا کہ اس نے ایک اور تانگے سے مس فریانرس کو اُترتے دیکھا۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ فریا نہیں کوئی اور ہو گی۔ کیونکہ اینگلوانڈین لڑکیوں کی شکل وصورت عام طور پر ایک جیسی ہوتی ہے۔ مگر جب فریا اُس کو دیکھ کر بے تابانہ آگے بڑھی تو اُس کو یقین آگیا کہ سچ مچ فریا ہی ہے۔ اُس کے دماغ میں سینکڑوں سوالات تلے اوپر پیدا ہوئے۔ لاہور میں یہ کیا کرنے آئی ہے اور کب آئی ہے؟ کیا اکیلی ہے، اس ہوٹل میں اس کا کون ہے؟ کیا اسی ہوٹل میں ٹھہری ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔؟

سعید ہوٹل کے نوکر کی ہتھیلی میں کچھ روپے دبا کر فریا کی طرف بڑھا اور اُس سے بڑے تپاک کے ساتھ ملا۔

''مس فریا کسے معلوم تھا کہ یہاں لاہور میں تم سے ملاقات ہو گی، تم کب سے یہاں آئی ہو؟''

اُس نے اور بہت سے سوال فریا سے کیے مگر اُس نے ایک کا جواب نہ دیا، وہ بڑی مضطرب تھی۔ اس قدر مضطرب کہ اُس کے چہرے پر ایک نا قابل بیان سکون پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دم کسی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ اس کا رنگ بہت زرد تھا اور اُس کے ہونٹوں پر سُرخی کے لیپ کے باوجود پپڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

ادھر اُدھر دیکھ کر فریا نے اُس سے کہا: مجھے آپ سے بہت باتیں کرنی ہیں۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے تانگے کی طرف دیکھا جس میں اسباب لدا ہوا تھا۔۔۔ مگر آپ ابھی ابھی آئے ہیں، یا کہیں جا رہے ہیں؟

مجھے یہاں آئے پورے ساتھ روز ہو گئے ہیں، اب میں یہ ہوٹل چھوڑ رہا ہوں۔

اس پر فریا کا رنگ اور زرد ہو گیا۔ تو بس اب آپ گھر جا رہے ہیں؟

نہیں نہیں! گھر تو میں دو ڈھائی مہینے کے بعد جاؤں گا۔ یہ ہوٹل کا سلسلہ مجھے پسند نہیں تھا، اس لیے میں نے اپنے لیے ایک علیحدہ کمرے کا بندوبست کر لیا ہے۔

"تو چلو مجھے وہیں ساتھ لے چلو" یہ کہہ کر وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ آپ کو اگر تکلیف نہ ہو تو۔ یعنی بات یہ ہے کہ مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے اور یہاں ہوٹل کے سامنے چند منٹوں میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔

سعید نے فریا کی طرف دیکھا تو اُس کی موٹی موٹی آنکھوں میں اُسے آنسو نظر آئے۔۔۔ نہیں نہیں، تکلیف کی کیا بات ہے۔۔۔۔؟

میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں وہاں تکلیف ہو گی، اس لیے کہ وہاں سامان وامان کچھ بھی نہیں۔ خالی کمرہ ہے، ابھی تک میں فرنیچر نہیں لا سکا۔۔۔۔

خیر دیکھا جائے گا، چلو آؤ۔۔۔۔"

کرایہ اور ایا چکا کر اور ہوٹل کے چھوکروں کو انعام دے دلا کر دہ دونوں مال روڈ کی طرف روانہ ہوئے راستے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ کیونکہ دونوں خیالات میں محو رہے۔ حتیٰ کہ وہ بلڈنگ آ گئی، جہاں دوسری منزل پر اُس نے اپنے لیے کمرہ کرایہ پر لیا تھا۔

اسباب وغیرہ رکھوا کر جب سعید نے فریا کی طرف دیکھا تو وہ لوہے کی چارپائی پر بیٹھی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ دروازہ بھیڑ کر وہ اُس کے پاس آیا اور ہمدردی بھرے لہجے میں اُس سے پوچھا: ''مس فریا کیا بات ہے تمہاری آنکھیں تو کبھی رونے والی نہیں تھیں۔۔۔۔۔؟''

یہ سُن کر فریا نے زور زور سے رونا شروع کر دیا، جس پر سعید بہت ہی پریشان ہوا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس لڑکی کو کس طرح تسکین دے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک نوجوان لڑکی اُس کے پاس بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔ اس کا دل بہت نرم تھا۔ چنانچہ فریا کے رونے سے اُس کو بہت دُکھ ہوا۔ گھبرا کر اُس نے کہا:

''مس فریا! تم مجھے بتاؤ تو سہی شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔۔۔۔؟''

فریا چارپائی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کھڑکی کھول کر اُس نے باہر بازار کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔۔۔۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔۔۔۔۔۔ میں اسی لیے تو آپ کے ساتھ آئی ہوں۔۔۔۔ اگر آپ سے میری اتفاقیہ طور پر ملاقات نہ ہوتی تو جانے اب تک میں سچ مچ زہر کھا کے مر جاتی۔۔۔۔ میرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔۔۔

آپ کو یاد ہو گا، ساڑھی ملنے پر میں نے آپ کو شکریہ کا خط لکھا تھا۔ اور آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ مجھے ضرور ملیں، اچھا ہوا آپ نہ آئے، ورنہ وہ میری پہلی خوشی دیکھ کر آپ کو بہت حیرت ہوتی۔۔۔۔ میری زندگی میں یہ انقلاب کیا آیا ہے گویا بھونچال آیا ہے جس کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خوبصورت مرد دھوکے باز ہو سکتے ہیں۔ مجھے اُس سے محبت پیدا ہو گئی۔ اُس نے بھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا، وہ اتنی اچھی باتیں کرتا تھا کہ ان کو سُن کر میرے دل میں ناچنے اور ناچتے چلے جانے کی خواہش پیدا ہوتی تھی، مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ سب خواب تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا میں بہت امیر آدمی ہوں، چنانچہ اُس نے مجھے ایک بہت عمدہ ڈریس پیش کیا۔ ایک انگوٹھی بھی بنوادی۔ وہ مجھ سے جلد از جلد شادی کرنا چاہتا تھا۔ میرے ماں باپ تو تھے نہیں کہ میں اجازت طلب کرتی، چنانچہ راضی ہو گئی۔ شادی کرنے کے لیے وہ مجھے لاہور لے آیا اور ہم دونوں اسی ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں آپ بھی کچھ روز رہے ہیں، سات آٹھ دن تک اس نے مجھے ہر طرح سے خوش رکھا لیکن ایک روز صبح اُٹھ کر میں نے دیکھا کہ اس کا اسباب وغیرہ سب غائب ہے اور اس کا بھی کوئی پتہ نہیں۔ میں نے اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اُس کا کوئی ٹھکانہ بھی تو مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کتنی غلطی کی۔ آپ یقین مانیے میں نے اُس کا پورا نام تک نہ پوچھا۔ خدا جانے وہ کون تھا کہاں کا رہنے والا تھا اور

کیا کرتا تھا۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے اور میں نرسنگ ہوم چھوڑ کر اُس کے ساتھ چلی آئی۔۔۔۔ شادی کرنے۔۔۔۔ میں کتنی خوش تھی اور شادی کرنے کے بعد گھر بنانے اور اُسے سجانے کے لیے میں نے دل ہی دل میں کتنے منصوبے باندھ رکھے تھے۔۔۔۔ اب میں کیا کروں ہسپتال کیسے واپس جاسکتی ہوں نرسیں کیا کہیں گی اور سسٹر میرا کتنا مذاق اُڑائے گی۔۔۔۔۔ میں نے مرنا چاہا مگر۔۔۔۔۔ مگر میں مرنا بھی نہیں چاہتی۔۔۔ مجھے زندہ رہنے کا شوق ہے۔ وہ مجھ سے شادی نہ کرتا۔ میرے ساتھ ایسے ہی رہتا۔۔۔۔۔ خدا کی قسم میں خوش تھی، مگر وہ کتنا ظالم نکلا۔۔۔۔۔۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میں نے اُس پر کوئی احسان۔۔۔۔ میں تو اُس کا احسان مانتی تھی کہ اس نے مجھے ایک نئی دنیا کا راستہ بتایا اور مجھے خوش کر نے کی کوشش کی۔۔۔ مگر وہ تو مجھے دھوکا دے گیا۔ اس نے ظلم کیا۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ ہوٹل والے مجھے شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ بیرے میری طرف یوں دیکھتے ہیں گویا میں چڑیا گھر کا کوئی پرندہ ہوں۔۔۔ میں ابھی تک وہاں صرف اسی لیے ٹھہری ہوں کہ ہوٹل والے یہ سمجھیں کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سب باتوں کا پتہ ہے۔ کیونکہ ایک روز بڈھے بیرے نے مجھ سے کہا:

''میم صاحب! وہ آپ کے صاحب اب نہیں آئیں گے، آپ چلی جائیں'' میں نے شکریہ ادا کرنے کی بجائے اس کو گالیاں دیں۔ کیا کروں میں چڑچڑی ہو گئی تھی۔ لیکن اب میرے دل میں سکون پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کا خیال میرے دل ودماغ سے دُور ہو جائے گا۔۔۔۔ مجھے دوست کی ضرورت ہے، لیکن۔۔۔۔ لیکن یہ میری دوسری بیوقوفی ہو گی اگر میں آپ کو دوست سمجھوں، کیا پتہ ہے کہ آپ مجھے دوست نہ بنانا چاہیں۔ ہسپتال میں آپ چند دن رہے، آپ نے ہمیشہ مجھ سے اچھا سلوک کیا، اس لیے میں سمجھی، شاید آپ میرے دوست بن سکیں۔۔۔۔۔۔ اچھا تو میں اب جاتی ہوں۔۔۔۔۔۔؟

یہ سُن کر جانے سعید کو کیوں ہنسی آگئی ''کہاں جاؤ گی۔۔۔۔ بیٹھ جاؤ'' اُس نے اُس کا بازو پکڑ کر اُسے چارپائی پر بٹھا دیا۔ جب وہ بیٹھ گئی تو دفعتاً سعید کے سارے جسم میں اس احساس سے ایک سنسنی سی دوڑ گئی کہ اس نے ایک نوجوان لڑکی کو یوں بے باکانہ بازو سے پکڑ کر بٹھایا ہے اور اس سے یوں بات کی ہے جیسے وہ اس کا ایک زمانے سے دوست ہے اور اس کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس احساس نے دہ جذبہ بالکل سلا دیا جو تھوڑی دیر پہلے فریا کے متعلق اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ وہ تمام باتیں جو ایک ایک کر کے اس کے دماغ میں بیجوں میں سے نکلنے والے ننھے پودوں کی طرح ابھری

تھیں دب گئیں اور وہ بے چین سا ہو گیا۔ اس کی اس بے چینی کو دیکھ کر فریا پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔۔۔۔۔۔
''میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں، یہ مجھے آج معلوم ہوا ہے، آج سے کچھ روز پہلے میں سمجھتی تھی، سب دُنیا میری ہے۔
۔۔۔ یہ دنیا پھر کبھی میری ہو گی۔۔۔۔۔ اس سوال کا جواب میں تو نہیں دے سکتی۔''
وہ آہوں میں باتیں کر رہی تھی۔۔۔ ''میں ہسپتال کبھی واپس نہیں جاؤں گی۔۔۔۔ کبھی نہیں جاؤں گی۔ لاہور میں چند دن میں نے بڑی خوشی سے گذارے ہیں میرے غم کے دن بھی یہیں گذریں گے۔۔۔۔''
میں یہاں کسی دُوکان میں ملازم ہو جاؤں گی اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ اور باقی دن یونہی بیت جائیں گے۔۔۔۔۔؟
یہ کہہ کر فریا پھر دروازے کی طرف بڑھی مگر سعید نے اُسے روک لیا مس فریا! جو کچھ تم نے کہا ہے اس کا مجھ پر بہت اثر ہوا ہے جس شخص نے بھی تم کو دھوکا دیا ہے نہایت ذلیل آدمی ہے۔ تم کو دھوکا دینا بہت بڑی بات نہیں ہے اسی لیے تم اس قابل نہیں ہو کہ تم سے فریب کیا جائے مجھے تم سے کامل ہمدردی ہے کاش! جو کچھ ہو چکا ہے میں اس کی اصلاح کر سکتا۔ پھر یک لخت سعید نے ایک نئے لہجے اور نئے انداز میں کہنا شروع کیا: فریا معاف کرنا، تم ایک بالکل غلط آدمی کے پاس آئی ہو تم سمجھتی ہو میں عورتوں سے واقف ہوں اور ان کو سمجھ سکتا ہوں۔ بخدا تم پہلی عورت ہو جس سے میں نے کھل کر بات کرنے کی کوشش کی ہے ہسپتال میں تم سے جتنی باتیں ہوتی تھیں بالکل مصنوعی تھیں۔ اس لیے کہ میں صرف ایک ایسی عورت سمجھ کر تم سے باتیں کرتا تھا جس سے میں جواب کے بغیر باتیں کر سکتا ہوں۔ تم ہماری سوسائٹی سے واقف نہیں ہو۔ ہم لوگ اپنی ماں بہن کے سوا اور کسی عورت کو نہیں جانتے۔ ہمارے یہاں عورتوں مردوں کے درمیان ایک موٹی دیوار حائل ہے۔۔۔۔ ابھی ابھی تمہارا بازو پکڑ کر میں نے تمہیں اس چارپائی پر بٹھایا تھا ، جانتی ہو میرے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ تم اس بند کمرے میں میرے پاس کھڑی ہو۔ جانتی ہو میرے دماغ میں کیسے کیسے خیالات چکر لگا رہے ہیں..... مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے میرے پیٹ میں ہلچل مچ رہی ہے ... میری رُوح ساکن ہو گئی ہے اور سارا جسم متحرک ہو گیا ہے۔ تم نے اپنے اس عاشق کی باتیں کی ہیں اور میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی رہی ہے کے اُٹھ کر تمہیں اپنے سینے سے لگا لوں اور اتنا بھینچوں ، اتنا بھینچوں کہ خود مجھے غش آ جائے، لیکن مجھے اپنے جذبات پر قابو پانے کا گر حاصل ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ میں اپنی کئی خواہشیں اب تک کچل چکا ہوں، تم حیران کیوں ہوتی ہو۔ میں سچ کہتا ہوں۔ عورت کے معاملے میں میری کوئی خواہش اب تک پوری نہیں ہوئی۔

تم پہلی عورت ہو جس کو میں نے اس قدر قریب سے دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ میں.... تمہارے اور زیادہ قریب جانا چاہتا ہوں لیکن..... لیکن میں شریف آدمی ہوں۔ میں تم سے محبت نہیں کرتا ہوں لیکن.... لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں یا چونکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔اس لیے میں تم سے دلچسپی نہ لوں گا.... یہ بات نہیں ہے.... محبت محبت.... میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ محبت کیا ہے جو محبت کیے جانے کے بالکل قابل نہیں... مجھے اس سے نفرت ہے بخدا اس کے نام سے ہی نفرت ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اسی نفرت نے اسی حقارت نے میرے دل میں اس کی محبت کے بیج بو دیئے ہیں

فریانے پوچھا: ''کون ہے یہ لڑکی۔۔۔؟

کون ہے! تم اسے جان کر کیا کرو گی....... ایک معمولی لڑکی ہے، جو بہت عرصے سے عورت بن چکی ہے اُس کا دل ودماغ لطافتوں سے خالی ہے، وہ گوشت پوست کی ایک پتلی ہے اور بس اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں''۔۔۔ میرے گھر میں نوکر ہے۔۔۔ پہلے کسی اور کی نوکر تھی میں اسی لیے امر تسر چھوڑ کر چلا آیا ہوں کہ اس کو دیکھ کر میرے دل میں ایک ناقابل بیان طوفان برپا ہو جاتا ہے۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ اُسے اپنے طریقے پر محبت کروں مگر وہ.... وہ..... مس فریا خدا کے لیے مجھ سے نہ پوچھو! کہ وہ محبت کو کیا سمجھتی میں جانتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ محبت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کا خام تصور اُس عورت کے ذہن میں ہے، مگر میں یہ بھی تو چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی وہ کسی اچھی بات پر، کسی چست فقرے پر کسی شاعر کے نازک خیال پر، کسی تصویر کی جاذب نظر لکیر پر تڑپ اُٹھے....... مگر اُس کی آنکھیں ان تمام چیزوں پر بند ہیں میں دماغ سے سوچتا ہوں وہ پیٹ سے سوچتی ہے، لیکن تماشہ تو یہ ہے کہ میں اُس سے محبت کرتا ہوں اور اس محبت نے میرے دل کے کواڑ دوسری محبتوں کے لیے بالکل بند کر دیے ہیں.... میں..... میں ہمدردی کے قابل ہوں.... یہ کہہ کر سعید چارپائی پر افسردگی کی حالت میں بیٹھ گیا اور مس فریانے اس کی پیٹھ پر یوں ہاتھ پھیر کر اُسے دلاسہ دینا شروع کیا جیسے وہ بچہ ہے اس کو فریا کی اس ہمدردی سے روحانی تسکین حاصل ہوئی اس کی ماں اکثر اس کی پیٹھ پر اسی طرح ہاتھ پھیرتی تھی۔ مگر فریا کے ہاتھ میں اُس نے اور ہی لذت پائی اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ واقعی ہمدردی کے قابل ہے۔اور دنیا کی سب عورتوں کو چاہیے کہ اس کی پیٹھ پر اسی طرح پیار و محبت سے ہاتھ پھیریں اور اُسے دلاسہ دیں۔ پھر یکایک اُسے کچھ خیال آیا اور اُس نے فریا کا دوسرا ہاتھ جو خالی تھا، اُٹھا کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا

اور شکریے کے طور پر اسے دبانا شروع کر دیا فریا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا اور کہا عجیب بات ہے تم ایک عورت سے محبت کرتے ہو اور پھر ساتھ ہی محبت کرنا نہیں چاہتے... وہاں سے بھاگ آئے ہو اور کسی دوسری عورت سے بھی محبت کرنا نہیں چاہتے اس پر سعید نے فریا کا ہاتھ چھوڑ دیا یہاں تو چاہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کسی عورت سے محبت کرنے کے لیے میں جتنے دن تڑپتا رہا ہوں اس کا تمہیں کچھ اندازہ نہیں۔اور پھر محبت کا جو نظریہ میرے دل و دماغ میں محفوظ ہے وہ بھی تمہیں معلوم نہیں۔ جس مصیبت میں آجکل میں گرفتار ہوں اس کا پیدا کرنے والا خود میں ہوں۔ اُس عورت کی محبت میں مجھے کسی باہر کی طاقت نے گرفتار نہیں کیا، میں خود اس جال میں پھنسا ہوں، اور اب خود ہی اس سے نقل بھاگا ہوں لیکن..... لیکن میں بالکل بے جوڑ باتیں کر رہا ہوں.... دراصل.... میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب میرا دل ایک عورت کی محبت سے بھرا ہے تو میں کسی دوسری عورت سے کیسے محبت کر سکتا ہوں وہ جذبات جو اُس عورت کے لیے میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں تمہارے لیے یا کسی اور کے لیے تو پیدا نہیں ہو سکتے..... میں جب اُس کا تصور دماغ میں لاتا ہوں تو خود کو اپنی سہولت کی خاطر مظلوم سمجھتا ہوں، لیکن تم سے بات چیت کرتے ہوئے یا تمہارا تصور دماغ میں لا کر میں اپنے آپ کو مظلوم نہیں سمجھتا، لیکن تم شاید میرا مطلب نہیں سمجھ سکی ہو۔ یہ کہہ کر وہ اضطراب کی حالت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ فریا نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا، دنیا میں عجیب و غریب آدمی بستے ہیں.... میں..... میں بہت ہی کوشش کرتی ہوں کہ اس کو جس نے مجھے ابھی دھوکا دیا ظالم یقین کروں۔اور ان لوگوں کو بھی جو اس سے پہلے مجھے فریب دے چکے ہیں، وحشی درندے سمجھوں، مگر جانے میں کیوں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں اُلٹا یہ سوچتی ہوں کہ شاید میں نے ہی ان پر ظلم کیا ہے۔ کیا پتہ ہے، مجھ سے ہی کوئی ایسی حرکت سرزد ہو گئی ہو جس سے ان کو دُکھ پہنچا ہو.... کبھی کبھی غصے میں آکر ان کو بُرا بھلا کہتی ہوں لیکن بعد میں افسوس ہوتا ہے..... آپ نرس کی زندگی کو اچھی طرح نہیں جانتے ہسپتال میں جو کوئی بھی آتا ہے روگی ہوتا ہے ہر مریض کو ہماری ہمدردی اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے..... لوگ مجھ سے عشق و محبت کی باتیں کرتے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ انہیں کوئی مرض ہے جس کا علاج میرے پاس ہے چنانچہ... میں... میں بڑی بیوقوف ہوں اور..... آپ.....،،،،

میں..... سعید سے مسکرا کر کہا:

’’میں سب سے بڑا بیوقوف ہوں..‘‘

فریا مسکرائی اور اچانک طور پر اُس نے سعید کے ہونٹ چوم لیے.... تھوڑی دیر کے لیے اس پر یدہ بوسے نے سعید کے ہوش گم کر دیے۔۔ وہ سخت گھبرا گیا..... مس فریا..... یہ کیا..... پھر سنبھل کر اُس نے کہا..... اوہ.... اوہ....... کچھ نہیں...... میں دراصل ایسی چیزوں کا عادی نہیں ہوں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا... میں... میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں" یہ سُن کر فریا بہت ہنسی، شکریہ!.... شکریہ..... تم بالکل بچے ہو..... ادھر آؤ.... اور خود آگے بڑھ کر اُس نے اُس کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جما دیئے۔ اس عمل نے سعید کو اور پریشان کر دیا،، مس فریا.... مس فریا..... فریا نے ہٹ کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا: تم بیمار ہو.... تمھیں ایک نرس کی ضرورت ہے۔۔۔" اپنی گھبراہٹ دور کر کے سعید مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے فریا سے کہا" مجھے فقط ایک نرس ہی کی نہیں اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ سب چیزیں ملتی نہیں ہیں میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ بہت سی خواہشیں میرے سینے میں اپاہج ہو چکی ہیں۔ میرے بہت سے احساسات لنگڑے ہو چکے ہیں۔۔اب تو یہ حالت ہو چکی ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکتا کہ میں کیا ہوں کہ ایک چیز کے لیے خواہش کرتا ہوں، پر ساتھ ہی یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس خواہش کا اظہار نہ کروں۔ اس میں کچھ تو سوسائٹی کے وضع کردہ اصولوں کا قصور ہے اور کچھ میرا اپنا.... میں ایک بہت بڑا آدمی ہوتا۔ یعنی میرے اندر ہر مخالف قوت کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہوتی تو بالکل جدا بات تھی مگر افسوس ہے کہ میں ایک معمولی انسان ہوں۔ جس کا ذہن اونچے مقاموں کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ یہ کتنی بڑی ٹریجیڈی ہے" فریا نے اُس کی بات سُنی اور تھوڑی دیر کے بعد کہا" لیکن میں نے تو کبھی اپنے آپ کو معمولی عورت نہیں سمجھا، شاید یہی خیال تمام مصیبتوں کی جڑ ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی سوچا ہے کہ میں غیر معمولی عورت ہوں۔ یعنی مجھ میں محبت کرنے کا مادہ دوسری عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور میں بہت مخلص ہوں مگر یہ عجیب بات ہے کہ میں کسی مرد کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرد عورت میں کیا چاہتے ہیں؟" میرا خیال ہے ایسی باتوں کے متعلق سوچنا ہی نہیں چاہیے.... مرد عورت میں کیا چاہتا ہے، عورت مرد میں کیا چاہتی ہے اور پھر یہ دونوں مل کر کیا چاہتے ہیں.... ہاں! یہ بتاؤ، اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ فریا زور سے ہنسی یہ چاہنے کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو گا..... سعید بھی ہنس پڑا۔ فریا بولی

"میں بہت افسردہ تھی، لیکن ان باتوں نے میری ساری افسردگی دُور کردی ہے۔یوں تو میں بہت دیر تک مغموم رہ بھی نہیں سکتی، لیکن پھر بھی جو باتیں آپ کے اور میرے درمیان ہوئی ہیں، اتنی اچھی اور خوشگوار ہیں کہ وہ تھکن جو میں تین چار روز سے محسوس کررہی تھی غائب ہوگئی ہے۔۔۔۔اب میں مستقبل کے متعلق صاف دماغ سے غور کروں گی ۔"

"کیاارادہ ہے؟" "کوئی خاص ارادہ تو نہیں، لیکن اب میں امرتسر واپس نہیں جانا چاہتی، کیونکہ مجھے وہاں پھر اس بات کا خطرہ رہے گا کہ کوئی آدمی کمپنی باغ میں گھومتا آنکلے گا اور میری کمزوریوں کا فائدہ اُٹھا کر چلتا بنے گا۔ میں اب یہاں لاہور ہی میں رہنا چاہتی ہوں.....آپ کب تک یہاں قیام کریں گے....؟

سعید نے جواب دیا: میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن خیال ہے دوڈھائی مہینے تک یہاں اور رہوں گا....میں خود امرتسر نہیں جانا چاہتا،، فریانے کہا" تو میں بھی دوڈھائی مہینے تک یہاں رہوں گی اُس کے بعد کوئٹہ چلی جاؤں گی، جہاں میری ایک بہن رہتی ہے، وہاں سے پھر کدھر جاؤں گی اس کے بارے میں سوچنا فضول ہے میرے پاس دوسو روپے تھے جن میں سے ڈیڑھ سو باقی رہ گئے ہیں۔ ہوٹل کا کرایہ وغیرہ چکا کر میرے پاس سو بچیں گے ان سے کیا دو مہینے کا گزارہ نہ ہوسے گا ؟"

"ہوجائے گا بشرطیکہ تم فضول خرچی نہ کرو میرے پاس صرف دوسو روپے ہیں اور مجھے اُن سے زیادہ سے زیادہ وقت بسر کرنا ہے جب امرتسر سے چلا تھا تو والدہ نے مجھے ڈھائی سو روپے دیے تھے اور میرا خیال ہے یہ ڈھائی ہزار روپیہ باقی بچا ہوگا، جو ہماری کل پونجی ہے۔"

سعید نے بالکل ٹھیک کہا، اس لیے کہ اس کی والدہ کے پاس اب مشکل سے ڈیڑھ ہزار روپیہ باقی بچا تھا۔ باپ کے پاس دس ہزار روپے تھے جن میں سے کچھ اُس نے اپنے والدہ کی زندگی میں فضول خرچیوں کے باعث ضائع کردیے اور کچھ اُن کی موت کے بعد اِدھر اُدھر برباد کردیے۔ سعید نے یہ روپیہ جسمانی عیاشیوں پر صرف نہیں کیا تھا۔اس کو لڑکپن میں عجیب وغریب شوق تھے۔ماں سے حیلے بہانے کے ذریعے سے یا صندوق میں سے روپیہ نکال کر اُس نے چوری چوری یعنی باہر ہی باہر کئی سائیکلیں خریدیں اور لطف یہ ہے کہ اُس کو سائیکل چلانے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ان سائیکلوں کو اُس کے دوست استعمال کرتے تھے اور وہ خوش ہوجاتا۔اُس طرح اس نے گھر میں سے روپیہ چرا کر ایک چھوٹی سینما

کی مشین خریدی، غالباً تین سو روپے کی اور یہ مشین وہ کبھی چلا نہ سکا، اُس لیے کہ اس کے دوست کے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ جہاں اُس نے اس کو چھپا کر رکھا تھا۔ دو بار گھر سے بھاگ کر بمبئی گیا اور ساتھ میں اپنے دوستوں کو لے گیا۔ وہاں بھی اس نے کوئی عیاشی نہ کی، مگر سارا روپیہ فضول برباد ہو گیا۔

سعید کا باپ اس پر اکثر سخت ناراض رہتا تھا۔ وہ ایک تیز طبیعت کا سخت گیر باپ تھا۔ اُس کو اپنے بیٹے کی ان حرکتوں پر سخت غصہ آتا تھا اور چنانچہ وہ اس کو کڑی سے کڑی سزا بھی دیتا، لیکن وہ اپنی زندگی میں اس کو سدھارنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سعید کی ماں اس کے باپ کے بالکل برعکس بے حد نرم طبیعت عورت تھی۔ اسے اپنے بچے سے اتنا پیار تھا کہ اگر کسی سے اس کا ذکر کیا جائے تو افسانہ معلوم ہو۔ اس لڑکے کی خاطر اس نے بہت دُکھ جھیلے، بے شمار تکالیف برداشت کیں، مگر اس کی ہر خواہش کو پورا کیا۔ وہ لوگوں سے کہتی تھی:

''مانتی ہوں، میرا لڑکا بہت فضول خرچ ہے، اس کو آگے پیچھے کا کوئی خیال نہیں، بڑا ہٹ دھرم ہے، لیکن دل اس کا برا نہیں۔۔۔۔۔ تم دیکھ لینا ایک روز سب دلدر دُور کر دے گا۔'' اب بھی اس کا یہی خیال تھا کہ ایک روز اس کا بیٹا جو پُر خلوص دل کا مالک ہے یک بیک نیا آدمی بن جائے گا اور سب لوگ حیرت سے اس کا منہ دیکھیں گے۔۔۔۔۔؟

ماں کے دل میں اپنے بیٹے کے متعلق مختلف خواہشوں اور امیدوں کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔۔۔۔ چونکہ سعید کی ماں پرلے درجے کی خوش اعتقاد اور خدا پر اعتماد رکھنے والی عورت تھی، اس لیے وہ کبھی ناامید نہیں ہوتی تھی۔ اُس کو خدا کے گھر سے اُمید تھی کہ اس کا اکلوتا بچہ بہت جلد سدھر جائے گا۔ اور اس کی تمام پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔ وہ ہر وقت خدا سے اس کی بہتری کی دُعا مانگتی رہتی تھی۔ کیونکہ اس کا ایمان تھا کہ ہر انسان اپنی مرضی سے بُرائیاں نہیں چھوڑ سکتا، اور صرف خدا کے فضل و کرم سے ہی اچھائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے لڑکے سے کبھی بازپرس نہ کی تھی۔

ادھر اُس کا لڑکا سعید خدا کے فضل و کرم سے بالکل غافل تھا۔ یہ غفلت ارادی نہیں تھی۔۔۔۔ کیونکہ اپنے افعال میں اسے صرف اپنا ہی ہاتھ نظر آتا تھا وہ ایک تیز دھارے میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ ایک زمانے سے اس کے خیالات مختلف شکلوں میں ظاہر ہو ہو کر اِدھر اُدھر بکھر رہے تھے۔

اس کی زندگی ایک ایسا افسانہ تھا جو کاغذ پر نہ لکھا گیا ہو۔ جس طرح افسانے کا پلاٹ بناتے وقت مصنف کے مختلف خیالات کا ایک الجھاؤ سا پیدا ہو جاتا ہے اور مربوط واقعات وحادثات کا ایک ڈھیر سا لگ جاتا ہے اسی طرح اُس کی زندگی ایسے بے شمار خام خیالات کا اجتماع تھی جو تلے اوپر افراتفری کے عالم میں پڑے تھے۔۔۔!

وہ ایک لمبی نہ ختم ہونے والی پیچ دار سڑک پر جا رہا تھا۔ بڑی تیزی کے ساتھ، جو کچھ اُس کے پیچھے رہ گیا تھا، اس پر اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ جو اُس کے آگے آنے والا تھا، اس سے بھی وہ بالکل بے خبر تھا۔ وہ ماضی اور مستقبل کی سرحدوں کے بیچ میں حال کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ایسا کھیل جس کا مطلب سمجھنے کے لیے اگر اُس نے کوشش بھی کی تو ناکام رہا۔۔

۔۔۔،

باپ کی سرزنش اور ماں کی مسلسل دُعا اس پر اثرانداز نہ ہو سکی اور وہ اپنی زندگی کو سمجھنے اور سمجھنے کی کوشش میں مصروف ایک ایسے راستے پر چلتا رہا، جو بیک وقت دشوار گذار اور سہل تھا۔

اُس کا باپ اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ہنگامی اور کج رفتار زندگی پر افسوس کرتا مر گیا۔ باپ کی موت نے اُس پر کافی اثر کیا۔ وہ کئی گھنٹے اپنے باپ کی لاش پر رویا، لیکن اُسی ماتم کے دوران میں اُس کا ذہن آنسوؤں کے آگے دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ آگے بہت آگے عورتوں کی چینخوں اور رونے دھونے کی بھیانک آوازوں کے اندر نہ جانے کہاں اس کی اندرونی سماعت ایسی آواز تلاش کر رہی تھی جس کو سن کر اسے روحانی سکون حاصل ہو جائے۔ اس کی آنکھیں روئیں، اس کا سارا وجود رویا۔ اس کو باپ کی موت کا واقعی بہت افسوس تھا۔ مگر روتے روتے ایک دم اُسے خیال آیا تھا۔ ۔۔۔ میں رو رہا ہوں، یہ لوگ جو آس پاس جمع ہیں، کیا دل میں یہ تو نہیں خیال کرتے کہ یہ سب ڈھونگ ہے۔۔۔ اس خیال نے سعید کو یک بیک ایسی نئی دنیا میں پھینک دیا تھا۔ اُس کے آنسو بالکل خشک ہو گئے اور وہ دیر تک اپنے باپ کے بے جان اور پر سکون چہرے کی طرف دیکھتا رہا تھا، جس پر اُس کی بدعنوانیاں نفرت اور غصے کے ملے جلے جذبات پیدا کر رہی تھیں۔۔۔۔!

باپ کو قبر کے سپرد کر کے جب وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ہمراہ گھر واپس آیا تھا اور رات کو اکیلے میں اُسے یہ محسوس کر کے بہت تعجب ہوا تھا کہ وہ بہت ہلکا ہو گیا ہے، جیسے اس کے وجود پر سے منوں وزن اُٹھا دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب سمجھنے کی اُس نے کوشش کی مگر ناکام رہا۔

باپ کی موت کے بعد اُس نے ایک روز بیٹھ کر بہت ارادے اپنے سینے میں جمع کیے اور تہیہ کر لیا کہ وہ اب اپنا نیا راستہ اختیار کرے گا۔ مگر یہ نیا راستہ اختیار کرنے پر بھی وہ اسی پرانے راستے پر گامزن رہا۔ یہ راستہ چند موڑوں کے بعد ہی اُسے اُسی پرانے راستے پر لے گیا جس پر وہ ایک عرصے سے چل رہا تھا۔ جب اُسے اس بات کا احساس ہوا تو اُس نے سوچا کہ زندگی خود راستے بناتی ہے۔ راستے زندگی نہیں بناتے۔ چنانچہ اس خیال پر زیادہ غور و فکر کیے بغیر وہ چلتا رہا اور چلتے چلتے اس کی راجو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس سے اپنا دامن بچا کر وہ بھاگا تو لاہور میں مس فریا سے اتفاقیہ طور پر ملاقات ہو گئی اور اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس اینگلوانڈین لڑکی کے لیے اُسے اپنا سفر کچھ دنوں کے لیے ملتوی کرنا پڑے گا۔

مسن فریا سے محبت کرنے کا خیال فضول تھا، کیونکہ اس کو اس زاویئے سے دیکھنے کا خیال ہی اُس کے دماغ میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فریا خوبصورت تھی۔ اُس میں وہ تمام باتیں تھیں جو مردوں کی خاص خواہشات پوری کر سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ وہ ایک ایسے سلیقے کی مالک تھی۔ جو سعید کی صناعانہ طبیعت کے بالکل موافق تھا۔ اب کہ حالات نے اُن دونوں کو ایک دوسرے کے بالکل پاس کھڑا کر دیا تھا۔ سعید کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ فریا کو چھو کر دیکھے۔ اس کو سمجھنے اور اس کی زندگی کا حدود اربعہ معلوم کرنے کا خیال اس کے دماغ میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

دیکھو مس فریا! اس نے ارادہ کر کے اپنا مافی الضمیر گول مول طریقے سے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، دیکھو! لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکا۔۔۔۔ اس پر فریا نے اُس سے کہا: تم کچھ کہتے کہتے کیوں رُک جاتے ہو، کہو، جو کچھ تمہیں کہنا ہے، کہو۔۔۔۔۔ ''میں نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔ الفاظ میری زبان پر آتے ہیں اور پھر اندر لڑھک جاتے ہیں۔۔۔۔ میری یہ کمزوری کبھی دور نہ ہو گی۔ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا''۔

''یہ اور بھی بُرا ہے، تم کچھ کہنا چاہتے ہو، اور پھر کچھ کہنا بھی نہیں چاہتے۔۔۔۔ اور یہ کیا مصیبت ہے۔''

''میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں، میں نے ایسی فضا میں پرورش پائی ہے جہاں آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ خیال بہت بڑی بدتمیزی متصور کی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ جہاں سچی بات کہنے والا بے ادب سمجھا جاتا ہے، جہاں اپنی خواہشات کا دبانا بہت بڑا ثواب خیال کیا جاتا ہے۔۔۔۔''

اس میں میرا کیا قصور ہے، میں۔۔۔۔ میں۔۔۔ تم سے اور کیا کہوں، تم خوبصورت ہو، تمہاری باتیں مجھے اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ میں بھی بُرا نہیں۔۔۔۔ لیکن پھر۔۔۔ لیکن پھر۔۔۔۔۔اور یہ تمہارا بوسہ۔۔۔۔۔ یہ تمہارا بوسہ ابھی تک میرے ہونٹوں پر چل رہا ہے۔۔۔۔۔ کیا یہ ہمیشہ یونہی چلتا رہے گا۔۔۔۔۔؟"

فریا نے اِس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا، ایک اور بوسہ تمہارے ہونٹوں پر چلاؤں۔۔۔ ۔۔۔دو ہو جائیں گے تو اچھا رہے گا۔

یہ سُن کر سعید نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا: "مس فریا میں تم سے ایک بات پوچھوں۔۔۔۔۔؟"

"بڑے شوق سے، ایک کے بدلے دو پوچھو۔۔۔۔۔ تین پوچھو۔۔۔۔اور چاہو تو پوچھتے جاؤ۔۔۔۔۔"

"میں پوچھتا ہوں، کیا تم سے محبت کرنا ضروری ہے۔۔۔۔یعنی کیا تم سے محبت کیے بغیر دوستی نہیں ہو سکتی۔"

"یہ سوال تمہارا بڑا عجیب و غریب ہے، محبت کے بغیر دوستی کیسے ہو سکتی ہے اور دوستی کے بغیر محبت بھی تو نہیں کی جا سکتی۔ تم الجھنوں میں خواہ مخواہ پھنس رہے ہو۔۔۔۔"

"۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے اس کے گال سُرخ ہو گئے" میں نے تو کبھی ایسی باتوں پر غور نہیں کیا، اور ایسی باتوں پر غور ہی کون کرتا ہے۔۔۔۔۔ سوچ بچار کے لیے اور تھوڑی چیزیں ہیں۔"

فریا میں ایک نئی دنیا کی سرحدوں پر کھڑا ہوں۔۔۔۔اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے میں بہت کچھ سوچنا چاہتا ہوں ، مگر عجیب مصیبت ہے کہ سوچ ہی نہیں سکتا۔۔۔ مگر مجھے سوچنا ضرور ہے۔اس کے بغیر گذارا نہ ہو گا۔۔۔۔۔؟"

فریا کے گال اور سُرخ ہو گئے "تم بالکل بچے ہو۔۔۔۔اس کے بغیر ہی اچھی طرح گذارہ ہو سکے گا۔۔۔۔ تم۔۔۔۔ تم۔۔ ۔آخر تم چاہتے کیا ہو۔۔۔۔؟"

فریا کے اس سوال نے سعید کو پریشان کر دیا۔۔۔۔۔

"میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں کیا چاہتا ہوں۔۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس رہو۔"

یہ کہہ کر سعید کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا سینہ ایک دم خالی ہو گیا ہے جیسے موٹر کے ٹائیر سے ہوا خارج ہو گئی ہے، چنانچہ گھبراہٹ کے عالم میں اُٹھا اور تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ فریا بیٹھی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فوراً ہی لوٹ آئے گا، مگر جب دس پندرہ منٹ گذر گئے تو اُس نے اُٹھ کر باہر بالکونی میں دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ نیچے بازار میں نظر

دوڑائی تو وہاں بھی سعید نظر نہ آیا۔ فریا کو تعجب ہوا کہ اُسے اکیلا چھوڑ کر آخر وہ کہاں بھاگ گیا ہے، واپس کمرے میں آکر وہ اس کا انتظار کرنے لگی۔۔۔۔۔۔

جرأت سے کام لے کر شام کو جب سعید واپس لوٹا تو وہ کمرے میں داخل ہونے لگا تو دروازہ بند تھا۔ اُس نے ہولے سے دستک دی، تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا، وہ اندر داخل ہوا تو فریا نے فوراً ہی کواڑ بھیڑ دیئے اور کہا ”تمہیں شرم نہیں آتی، اتنی دیر کے بعد گھر واپس آئے ہو۔۔۔۔ لیکن چھوڑو اِن باتوں کو۔۔۔۔ بتاؤ کہ اب کیا کھائیں گے اور کہاں کھائیں گے مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے“۔

وہ جواب میں فریا سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُس کی نگاہیں لوہے کی چار پائی پر پڑیں، بستر بچھا ہوا تھا، تکیئے پڑے تھے، تکیوں کے پاس ہی اس کا وہ ناول رکھا تھا جو اُس نے ابھی تک صرف آدھا ہی پڑھا تھا۔ اس کے چاروں شو بڑے سلیقے سے ایک قطار میں چار پائی کے نیچے رکھے تھے۔ چمڑے کے ٹرنک گھسیٹ کر کونے میں رکھ دیئے گئے تھے۔ اور سامنے کھڑکی کی سل پر اُس کا ٹائم پیس پڑا تھا۔ ادھر دائیں ہاتھ کو جو غسلخانہ تھا اُس کا دروازہ کھلا تھا۔ اور اُس نے دیکھا کہ اسٹینڈ پر تولیہ لٹک رہا ہے۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک زمانے سے اس کمرے میں آباد ہے اور فریا کو وہ ازل سے جانتا پہچانتا ہے۔ اُس کو اِس احساس نے بڑی راحت بخشی۔

خوش ہو کر سعید نے کہا:

”فریا! بھئی ایک بات کی کمی رہ گئی ہے اُدھر جنگلے پر تمہارے دُھلے ہوئے بنیان لٹکنے چاہئیں اور ساتھ والا کمرہ خالی پڑا ہے، اس میں تمہارا سنگھار میز ہونا چاہیے اور اُس پر پوڈر اور کریموں کے ڈبے بکھرنے چاہئیں۔ اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اگر ایک پنگوڑا بھی آجائے تو کیا حرج ہے۔ واللہ پورا خاندان جمع ہو جائے اور میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ لیکن ضرورت سے زیادہ تو نہیں کہہ گیا۔۔۔۔“

فریا نے بڑھ کر اُس کے گلے میں باہیں حمائل کر دیں۔۔۔۔۔۔ ”تم بے کار باتوں کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دیا کرو۔۔۔۔۔ ساتھ والا کمرہ کل ہی لے لینا چاہیے۔ سنگھار میز بھی رہے، لیکن یہ پنگوڑے کی بات غلط ہے۔ مجھے اتنی جلدی مکمل عورت بننے کی خواہش نہیں اور میرا خیال ہے کہ تم باپ بننے کے اہل بھی نہیں ہو۔۔۔۔ لیکن کھانا کھانے کے متعلق

تمہارا کیا خیال ہے، میں کہتی ہوں، وہیں ہوٹل میں آخری ڈنر اُڑایا جائے اور کرایہ ورایہ چکا کر میں اپنا اسباب یہاں لے آؤں۔۔۔۔۔۔"

یہ سُن کر سعید گھبرایا۔۔ فریا کی باہیں علیحدہ کر کے اُس نے کہا:

"مگر۔۔۔۔ مگر اس کمرے میں دو آدمیوں کی جگہ کہاں ہے۔۔۔۔؟"

ہٹاؤ جی! فریا نے اپنا ہینڈ بیگ کھول کر گالوں پر پوڈر لگاتے ہوئے کہا:

"دیکھا جائے گا۔۔۔۔۔ اس کمرے میں تو ایک درجن مریض سما سکتے ہیں اور ہم تو صرف دو ہیں، دراصل تم بالکل وہ ہو۔۔۔۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ گھر بار کیسے چلایا جاتا ہے۔۔۔۔۔ چلو اب باہر چلیں۔۔۔۔"

(۸)

"سعید بے حد خوش تھا"

فریا کے ساتھ رہتے ہوئے اُسے پورے دس روز ہو گئے تھے ساتھ والا چھوٹا کمرہ انھوں نے کرایہ پر لے لیا تھا۔ سنگھار میز بھی آ گیا تھا، اور ادھر دوسرے کمرے میں ایک چھوٹی تپائی اور تین کرسیاں بھی لا کر رکھ دی گئی تھیں۔ زندگی بڑے مزے میں گذر رہی تھی۔

فریا خوش تھی کہ اُسے اتنا اچھا رفیق مل گیا، جس کا دل دھوکے بازی سے بالکل پاک ہے اور سعید خوش تھا کہ اُسے عورت مل گئی ہے۔۔۔۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے ایک ایسی عورت مل گئی ہے۔۔۔ جس کو وہ چھو کر دیکھ سکتا ہے۔ اور جس سے بے تکلف باتیں کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ جو سلیقے کی مالک ہے اور اُسے خوش رکھنے کے بہت سے طریقے جانتی ہے۔۔۔۔۔!

فریا خوش ذوق تھی، نفاست پسند تھی اور سب سے بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ اُس کی جسمانی محبت میں بھی ایک خلوص تھا۔ ایسا خلوص جو سردیوں میں دھکتے ہوئے کوئلوں کے اندر دکھائی دیا کرتا تھا۔۔۔۔۔

دس دن ان کو اکٹھے رہتے گذر گئے تھے، مگر وہ محسوس کرتے تھے کہ ہمیشہ ہی سے اکٹھے تھے۔ فریا اپنی موجودہ زندگی پر غور و فکر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن سعید کے دماغ میں یہ خیال کبھی کبھی بھنبھناتی ہوئی مکھی کی طرح داخل ہو جاتا تھا۔

کہ اگراُس کے کسی رشتہ دار یا دوست نے یہ سب کچھ دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ چنانچہ اس خیال سے اُسے بہت اُلجھن ہوتی تھی۔اور ایک عجیب و غریب خواہش اُس کے دل میں پیدا ہو جاتی تھی کہ ساری دنیا تھم جائے۔۔۔۔۔وہ خود ساکن ہو جائےاور سب لوگ بے جان پتھروں کے مانند ہو جائیں۔

وہ سوچتا، ''یہ آخر کیا ہے، میں جس طرح چاہوں اپنی زندگی بسر کروں، لوگوں کواس سے کیا سروکار۔۔۔۔۔میں اکثر شراب پیتا ہوں تو دوسروں کے باوا کا اس میں کیا جاتا ہے۔ میں اگر عورت کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں تو اس میں دوسروں کی اجازت لینے کا مطلب ہی کیا ہے۔۔۔۔کیا میں اپنے افعال کا خود ذمہ دار نہیں۔۔۔''

لیکن پھر وہ سوچتا کہ ایسی باتوں پر غور وفکر کرنا بالکل فضول ہے۔اس لیے کہ وہ معاشرتی نظام کی ان خرابیوں کو دُور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔وہ ایک معمولی انسان ہے جس کی آواز شورشِ کائنات میں کبھی نہیں اُبھر سکتی۔

وہ خوش تھا، بہت خوش، مگراس خوشی کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ایک مدہم لکیر کی طرح دوڑ رہا تھا کہ وہ کسی روز پکڑا جائے گااور اُسے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے سامنے ذلت اُٹھانا پڑے گی۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اُسے زبردستی ذلیل ہونا پڑے گا، یعنی اپنی مرضی کے بالکل خلاف۔۔۔۔وہ بالکل مجبور ہوگا۔وہ تمام باتیں جو سعید کے دل میں تھیں اور وہ تمام باغیانہ خیالات جواس کے دماغ میں تھے وہیں کے وہیں دھرے رہ جائیں گے۔اوراُس کا سر جھک جائے گا، اُس کو شرمندہ ہونا پڑے گا، بغیر احساس ندامت کے۔۔۔۔۔،

ایک روزاتفاقاً ایسا ہوا کہ سعید اور فریا دونوں شام کو چارلی چپلن کا فلم ماڈرن ٹائمز دیکھنے گئے۔جب کھیل دیکھ کر سینما ہال سے باہر نکلے تو ایک آدمی نے اُن کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔فریا نے اُس سے کہا:

''یہ آدمی تمہیں بڑے غور سے دیکھ رہا ہے، تمہارا دوست تو نہیں؟''سعید نے اُس گھورنے والے آدمی کی طرف دیکھا اور زمین اُس کے پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔۔۔۔۔۔یہ اُس کا دور دراز کا ایک رشتہ دار تھا جو لاہور ہی میں رہتا تھا۔ اور کسی کالج میں تعلیم حاصل کر رہا تھااُس نے سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیااور فریا کو ساتھ لیے بغیر جلدی سے اس بھیڑ میں داخل ہو گیا جو صدر دروازہ پر جمع تھی۔

باہر نکل کر جو پہلا ٹانگہ نظر آیا، سعید اُس میں بیٹھ گیا۔اتنے میں فریا آگئی، جلدی سے اُس کو ٹانگے میں بٹھا کر اُس نے گھر کا رُخ کیا۔راستے میں اُن کی کوئی بات نہ ہوئی۔ لیکن جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئے فریا نے پوچھا:

''یہ ایک دم تمھیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔ وہ آدمی کون تھا، جس سے ڈر کر تم مجھے چھوڑ کر باہر بھاگ گئے۔۔۔۔؟''

ٹوپی اُتار کر سعید نے چارپائی پر پھینک دی اور کہا:

''میں اس کا نام تو نہیں جانتا، لیکن وہ میرا رشتہ دار ہے۔۔۔اب بات نکلتی نکلتی کہاں کی کہاں پھیل جائے گی۔۔۔''

فریا زور سے ہنسی: ''بس۔۔۔؟۔۔ بس اتنی بات کو جناب نے افسانہ بنا دیا۔۔۔اجی ہٹاؤ۔۔۔۔۔ کون سی بات کہاں تک پھیلے گی۔۔۔۔ تم بڑے وہی ہو۔۔۔ چلو آؤ ادھر میں تمہارے گلے پر مالش کر دُوں۔۔۔۔اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دو گے تو مجھے یاد نہ رہے گا۔۔۔۔ تمہارا اگلا کل سے خراب ہے۔۔۔۔۔بس اب میں کچھ نہ سُنوں گی۔۔۔۔اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ ٹھہرو کوٹ میں اُتار دیتی ہوں۔''

کوٹ اور ٹائی اُتار کر فریا نے سعید کے گلے پر ایک روغن کی مالش کرنا شروع کر دی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے رشتہ دار کی مڈبھیڑ کو بھول گیا۔

مالش کرتے کرتے فریا نے اُس سے کہا:

''ارے۔۔۔۔ ڈنر کھانا تو ہم بھول ہی گئے، تم افراتفری میں یہاں دوڑ آئے اور سارا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ سینما دیکھ کر کھانا ''استفل'' میں کھائیں گے۔۔۔۔اور یوں اتوار کی عیاشی پوری ہو جائے گی۔۔۔۔اب کیا خیال ہے؟۔۔۔ میرا خیال کیا پوچھتی ہو، چلو، مگر مجھے تو بھوک نہیں ہے۔۔۔۔۔اور پھر میرا اگلا بھی خراب ہے۔''

تو ایسا کرو، بھاگ کر نیچے سے ایک ڈبل روٹی لے آؤ۔۔۔۔ تھوڑا سا پنیر اور مکھن یہاں پڑا ہے۔۔۔۔۔ جام بھی ہے۔۔۔ ۔دو توس تم کھا لینا، باقی میں کھا لوں گی۔۔۔۔ یہ عیاشی بھی بُری نہیں۔۔۔۔استفل میں کھانا اگلے اتوار سہی۔

سعید ڈبل روٹی لے آیا مس فریا نے یوں چٹکیوں میں تپائی پر کپڑا بچھا کر ڈنر چن دیا۔ اور دونوں کھانے میں مشغول ہو گئے۔

ایک توس مکھن لگا کر فریا نے اُس کو دیا اور کہا، یونہی اگر دن بیتتے چلے جائیں تو کتنا اچھا ہو۔۔۔۔۔ میں زندگی سے اور کچھ نہیں مانگتی۔۔۔۔۔ صرف ایسے دن مانگتی ہوں، جو اس توس کی طرح مکھن لگے ہوں:

سعید نے جو اپنی ہونے والی بدنامی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ فریا کے چکنے گالوں کی طرف دیکھا اور اُس کے دل کے ایک کونے میں یہ خواہش سر سرائی کہ وہ اُٹھ کر اُنھیں چوم لے۔ سعید ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ فریا مسکراتی ہوئی اُٹھی اور اپنے موٹے جذبات بھرے ہونٹ سعید کے ہونٹوں سے پیوست کر دیے۔

ایک لمحے کے لیے سعید کو ایسا محسوس ہوا کہ فریا کے ہونٹوں کے وزنی لمس نے جھنجوڑ کر اُس کی روح کو آزاد کر دیا ہے، چنانچہ اُس نے زور سے فریا کے سخت سینے کو اپنی کمزور چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا، اور دوسرے لمحے وہ دونوں آہنی پلنگ پر ایک دوسرے میں مدغم تھے۔

سعید دیوانہ وار فریا کے سانولے گالوں، موٹے ہونٹوں اور حیرت میں پھڑ پھڑاتی ہوئی کالی آنکھوں کو چومنے لگا۔ فریا کو سعید کی یہ مردانہ حرارت پسند آئی اور اُس نے اپنے آپ کو اس کی آغوش کے سپرد کر دیا۔

دفعتاً سعید کو فریا کی اس سپردگی کا احساس ہوا اور جس طرح تھرمامیٹر کو برف دکھانے سے پارہ نیچے گرتا ہے اسی طرح سعید کی ساری حرارت اس کے ڈرپوک دل میں سمٹ آئی اور وہ ماتھے کا سرد پسینہ پونچھتا ہوا فریا کی آغوش سے علیحدہ ہو گیا۔

فریا کے متوقع جذبات کو بڑے زور سے دھکا لگا۔ اُس نے بھینچی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا: کیا بات ہے سعید۔۔۔؟

"کچھ نہیں"

یہ کہہ کر سعید کی گردن جھک گئی، اس کا لہجہ ضعیف ہو گیا:

"میں تمہارے قابل نہیں ہوں"

یہ سُن کر فریا کے ہونٹ مادرانہ شفقت سے کھلے "ڈارلنگ" کہہ کر وہ اُٹھی اور اپنے دونوں بازو سعید کی گردن میں حمائل کر دیے۔

"بے وقوف مت بنو"

سعید نے اُسی ضعیف لہجے میں جواب دیا:

''میں خود نہیں بنتا، بیو قوف یا چغد جو کچھ بھی ہوں، میرے ماحول کی صنعت گری ہے، یہ کہہ کر اُس نے فریا کی باہیں آہستہ آہستہ ہٹالیں۔ اس کے لہجے میں اب غم بھی شامل تھا۔۔۔۔ مجھ میں اور تم میں بہت فرق ہے۔ تم آزاد ماحول کی پیداوار ہو۔ تم انگریز نہیں ہو۔ تمہارا رنگ حاکم قوم کے رنگ سے نہیں ملتا۔

لیکن اس کے باوجود تم غیر محسوس طور پر یہ محسوس کرتی ہو کہ تمہارا درجہ ہم ہندوستانیوں سے بہت اُونچا ہے۔ لیکن چھوڑو اس کو، تم علانیہ مجھے ڈارلنگ کہہ سکتی ہو۔ لیکن تخلیئے میں بھی تمہیں ڈارلنگ کہتے ہوئے میری زبان رُک جائے گی۔ تم جانتی ہو کہ تمہارا مصرف کیا ہے، لیکن مجھے میرا مصرف کچھ اور ہی بتایا گیا ہے۔ تمہارے اعصاب آزاد ہیں، لیکن میرے غلط ماحول کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تم مکمل ہو لیکن مجھے میرے تمدن نے اُدھورا چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔ ایسی جگہ پر اُدھورا چھوڑا ہے کہ میری تکمیل میرے احساس نا تکمیلی سے بھی نہیں ہو سکتی''

فریا، جس کے کانوں میں ابھی تک سعید کی مردانہ حرارت کی سرگوشیاں جھنجھنا رہی تھیں۔ سعید کی اس خام فلسفیانہ گفتگو کا کچھ مطلب نہ سمجھی۔۔۔۔ ''جانے تم کیا کہہ رہے ہو؟''

سعید پلنگ پر بیٹھ گیا، جیب سے سگریٹ نکال کر اس نے فریا کی طرف دیکھا۔ جس کی آغوشِ محبت میں سے وہ ابھی ابھی نکلا تھا۔ اُس احساس سے کہ اپنی اور فریا کی تندرست خواہش کو اُس نے بڑے ہی بھونڈے طریقے پر اُدھورا چھوڑ دیا تھا۔ سعید کو سخت روحانی کوفت ہوئی، چنانچہ اُس نے فریا سے کہا:

''تم میری اُلجھی ہوئی باتیں نہیں سمجھو گی، اس لیے کہ تمہاری زندگی کے تار بالکل سیدھے ہیں۔ لیکن یہاں میرے دماغ میں الجھاؤ کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔۔۔۔ میں نے ایک بار پہلے کہا تھا کہ میں تمہارے قابل نہیں۔

ایک بار پھر کہتا ہوں۔۔۔ فریا! میں تمہارے قابل نہیں۔''

فریا نے چڑ کر پوچھا: ''کیوں۔۔۔۔؟''

بتاتا ہوں۔۔۔۔ لیکن تم مجھ سے پہلے یہ پوچھو۔۔۔۔ ''سعید کیا تم اپنی بیوی بنا کر مجھے اپنے گھر لے جا سکتے ہو؟''

فریا نے بڑی بے ساختگی سے کہا:

''لیکن لیکن میں نے تم سے کب کہا ہے کہ مجھ سے شادی کرو''

سعید نے سگریٹ سلگایا اور ذرا سوچ کر کہا:

""تم نے مجھ سے ایسا نہیں کہا۔۔۔ لیکن میں نے بارہا اپنے دل میں یہی سوال کیا ہے۔اور مجھے ہمیشہ ہی حوصلہ شکن جواب ملا ہے کہ سعید تم میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ جب میرے سوال کا یہ بزدلانہ جواب ہے تو بتاؤ میں کیوں کر تمہاری نوازشوں کے قابل ہوں؟""

فریا کے تشنہ جذبات بول اُٹھے:

""کیا ہم شادی کے بغیر ایک دوسرے سے محبت جاری نہیں رکھ سکتے؟""

یہ سُن کر سعید کے دل میں سمٹی ہوئی حرارت تھوڑی سی پھیلی، لیکن وہ فریا کے پہلو سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ""نہیں""

""کیوں۔۔۔؟""

اس لیے کہ میں یہاں چوروں کی طرح رہتا ہوں۔۔۔۔ آج ہی کی مثال۔ سینما کے باہر ایک رشتہ دار کو دیکھ کر۔۔۔۔ ۔جس کا نام بھی مجھے یاد نہیں۔۔۔۔ میرے اوسان کیسے خطا ہو گئے تھے،اور میں نے تمہیں اپنی توجہ سے یوں محروم کر دیا تھا، جیسے تم میرے لیے بالکل اجنبی ہو۔ایسے ذلیل آدمی کے ساتھ رہ کر تمہیں زندگی کا کیا لُطف آ سکتا ہے جو ابھی ابھی عورت کی آغوشِ محبت جیسی لطیف نعمت کو ٹھکرا کر ایک طرف ہٹ گیا تھا۔

فریا مسکراتی ہوئی پلنگ پر سے اُٹھی اور ایک بار پھر اپنی باہیں سعید کے گلے میں ڈال دیں۔

""تم بڑے اچھے ہو سعید۔۔۔۔ ایک فقط میں ہی محبت کرنا نہیں جانتی۔""

فریا کی بے پناہ سادگی نے سعید کی گھائل رُوح پر ایک اور چرکا دیا۔۔۔۔ اُس نے آہستہ سے فریا کے پریشان بال سنوارے اور کہا:

""نہیں۔۔۔ یہ میرا جرم ہے اور میں اس کی سزا ایک مدت سے بھگت رہا ہوں۔۔۔ تم سے علیحدہ ہوا تو یہ سزا بامشقت ہو جائے گی""۔

فریا چیخ اُٹھی:

""تم مجھے چھوڑ دو گے۔۔۔؟""

سعید جواب میں صرف اتنا کہہ سکا:

""مجھے اپنے آپ سے یہی اُمید ہے""

فریا بلک بلک کر رونے لگی۔ سعید چند لمحات خاموش کھڑا رہا، لیکن اس مختصر عرصے میں اُس کے دل کی سمٹی ہوئی حرارت اُس کے سارے جسم میں پھیل گئی تھی۔ اُس نے سُرخ آنکھوں سے فریا کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر داغ دیئے۔

ایک بار پھر آہنی پلنگ پر وہ ایک دوسرے میں مدغم تھے۔